تاریخ اسلام

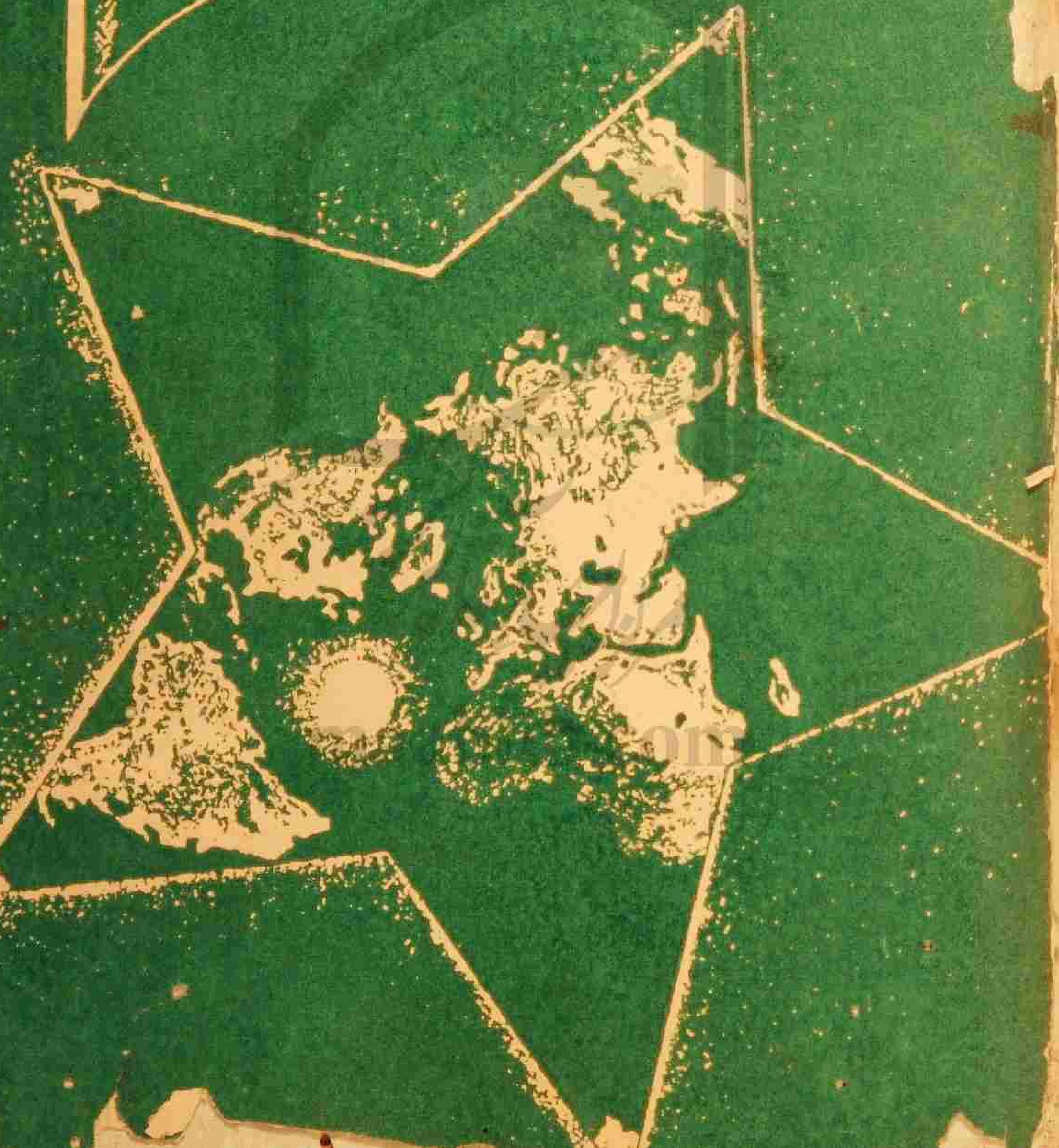

سلسلہ اشاعت امامیہ مشن۔ لکھنؤ ۲۸۰

تاریخ اسلام

حصہ سوم

از قلم

سرکار سید العلماء الحاج مولانا السید علی نقی النقوی مدظلہ
مجتہد العصر

مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ

قیمت پانچ روپیہ

تعارف

اس سے قبل تاریخ اسلام کے دو حصے شائع کیے جا چکے ہیں اور اب بحمد اللہ امسال یہ تیسرا حصہ شائع کیا جا رہا ہے۔ افراد ملت سے استدعا ہے کہ اس کی نشر و اشاعت کی طرف مخصوص توجہ فرمائیں تاکہ ہم جلد ہی اس کے بقیہ حصص بھی شائع کر سکیں۔

دنیا کا کوئی کام بغیر پیسہ کے ممکن نہیں۔ ان اہم دینی ضروریات کے لئے مخیر افراد ملت کو خصوصی طور پر توجہ کی ضرورت ہے۔

تاریخ کے ان حصص نیز مشن کے دیگر ضخیم و مجلد کتاب کو ہر مقام کے مومنین کو اپنے یہاں تمام لائبریریوں کو خرید کر داخل کرنا چاہیئے تاکہ برادران وطن بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ پہلا اڈیشن ربیع الثانی ۱۳۸۱ھ شائع ہوا تھا جو ختم ہو گیا۔ اب دوسرا اڈیشن جمادی الاول ۱۳۹۷ھ میں پیش کیا جا رہا ہے

خادم ملت

مرزا عابد حسین

آنریری جنرل سکریٹری

امامیہ مشن لکھنؤ ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علےٰ سید الانبیاء والمرسلین محمد ن المصطفےٰ خاتم النبیین وآلہ الطیبین الطاھرین المعصومین۔

رجیع اور بئر معونہ

دو اندوہناک المیئے

اُحد سے جو اندوہناک حوادث کا سلسلہ شروع ہوا وہ اِس کے بعد بھی جاری رہا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی رجیع کا اندوہناک واقعہ ہوا اور پھر بالکل اُسی نوعیت کا مگر اُس سے زیادہ شدید بئر معونہ کا المیّہ وقوع پذیر ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں قریش یعنی اہل مکہ ہی کی سازش تھی[۱]۔

معلوم ہونا چاہیے کہ علم غیب بعطیۂ الہٰی حسب مشیّت ربانی رسول یا امام کو ہوتا ہے مگر روزمرّہ کی زندگی میں اطلاعات پر عمل بھی ہوتا تھا اور لوگوں کے قول و قرار پر اعتبار بھی ———— یہی اُن کا من جانب اللہ فریضہ تھا جس میں ظاہری طور پر عام زبان میں

---

[۱] تاریخ "مسلمانانِ عالم" حصہ اول صفحہ ۷۷

اُنھیں زک بھی اُٹھانا پڑی ہے چنانچہ ان دونوں واقعوں میں یہی صورت تھی۔

رجیع کا معاملہ یہ تھا کہ عرب کے بعض قبائل نے جن کا نام علامہ طبرسی نے عضل و ریش لکھا ہے۔ ابن خلدون نے "عضل اور قارہ بنی الھون ابن خزیمہ اخوۃ بنی اسد[1]" اور "مسلمانان عالم" کے مصنف نے (غالباً غلط طور پر) عقل اور فارد لکھا ہے، رسول اکرمؐ کے پاس وفد بھیجا اور کہلوایا کہ ہم اسلام لانا چاہتے ہیں۔ اپنے یہاں کے کچھ آدمی ہمارے یہاں بھیجئے کہ ہمیں قرآن اور مذہبی مسائل کی تعلیم دیں۔

اُنھیں یہ معلوم ہوگا کہ اسی قسم کی خواہش مدینہ والوں نے حضرتؐ سے اُس وقت کی تھی جب آپ مکہ میں تھے تو آپ نے مصعب بن عمیر کو اُن کے یہاں بھیج دیا تھا لہٰذا ہم بھی ایسی خواہش کریں تو اصولاً رسولؐ کو ہماری دعوت کی پذیرائی کرنا چاہیئے۔ چنانچہ حضرتؐ نے مرثد بن ابی مرثد غنوی کی سرکردگی میں چھ افراد کو اپنے اصحاب میں سے روانہ کیا۔

جب یہ لوگ بطن رجیع میں پہونچے جو عسفان کے قریب قبیلۂ ہذیل کا چشمہ تھا تو اُن "میزبانوں" نے غدّاری کر کے قبیلۂ ہذیل کو خبر دی اور جنگ کے لئے للکار دیا جنھوں نے حملہ کر دیا اور یہ سب

---

[1] تاریخ ابن خلدون طبع بیروت جلد ۲ ص ۷۶۸

قتل ہو گئے[1]۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حملہ ہونے پر جب یہ لوگ مقابلہ پر آمادہ ہو گئے تو اُن لوگوں نے انھیں جان کی اماں دی اور کہا ہم تمھیں زندہ مکہ والوں کے پاس لے جائیں گے اور اُن سے رقم حاصل کریں گے۔ اِس پر تین بزرگواروں نے جن میں اُن کے سردار مرثد بھی تھے انکار کر دیا اور وہ جنگ کر کے شہید ہو گئے۔ باقی تین کو انھوں نے قید کیا اور مکہ کی طرف لے چلے۔ اُن میں سے بھی ایک نے راستہ میں لڑ کر جان دیدی اور خبیب اور زید کو انھوں نے مکہ لے جا کر قریش کے ہاتھ فروخت کر دیا[2]۔

مسٹر کے۔ اے حمید لکھتے ہیں کہ "باقی ماندہ کو سفیان ہذلی مکہ لے گیا۔ جنھوں نے نہایت بے رحمی سے انھیں سخت سے سخت ایذائیں دیں اور آخر کو پھانسی پر لٹکا دیا۔

حضرت خبیب رضؓ کے واقعۂ قتل کو دنیا فراموش نہیں کر سکتی جب آپ کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا گیا تو آپ نے فی البدیہ چند شعر کہے جن کے ہر لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کس قسم کے لوگ تھے۔ ان کے دلوں میں راست بازی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ تو اُس شمع کے پروانے تھے جو دنیا کے اندھیرے کو ہمیشہ کے واسطے فنا کرنے کے لئے جلائی گئی تھی۔ ان کے اشعار کا

---

[1] اعلام الوریٰ [2] ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔

ترجمہ یہ ہے :-

"کافروں کے گروہ درگروہ میرے پاس جمع ہوئے ہیں
میں اِس ہلاکت گاہ میں بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں ---
ان کافروں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو بلالیا ہے اور مجھ کو
ایک مضبوط شہتیر کے پاس لاکر کھڑا کردیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ
اگر کفر اختیار کرو تو تمھاری جان بخشی ہوسکتی ہے۔ میں
کفر اختیار کرنے سے موت کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں دشمنوں
کے سامنے نہ عاجزی کروں گا نہ روؤں گا اور نہ چلاؤں گا
مجھے یقین ہے کہ میں خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لئے
جارہا ہوں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ البتہ دوزخ
کی آگ سے ڈرتا ہوں۔ اے عرش کے مالک تو مجھ کو
اس مصیبت کبریٰ میں صبر عنایت فرما۔ ان کافروں نے
میرے گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے ہیں اور میں
زندگی سے مایوس ہوچکا ہوں۔ خدا کی قسم جب میں
اسلام پر فدا ہورہا ہوں تو مجھ کو پروا نہیں کہ کس پہلو
گرتا ہوں اور کس طرح جان دیتا ہوں[1]"

اسی کے بعد جنگ اُحد سے چار مہینہ بعد بئر معونہ کا واقعہ نجد

---

[1] تاریخ "مسلمانانِ عالم" صفحہ ۷۷، ۷۸

کی سرزمین پر پیش آیا۔ بعض مؤرخین نے تصریح کی ہے کہ یہ صفر ۴ھ کا واقعہ ہے[۵]۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ابو البراء عامر بن مالک بن جعفر مُلاعِبُ الاَسِنّہ نے آکر رسولؐ سے عرض کیا آپ کچھ آدمیوں کو اہلِ نجد کی طرف روانہ فرمائیں جو اُنھیں دعوت اسلام دیں تو مجھے اُمید ہے کہ وہ آپ کی دعوت کو قبول کریں گے۔

حضرتؐ نے فرمایا مجھے نجد والوں پر اطمینان نہیں ہے ابو براء نے کہا میں ذمّہ دار ہوں۔ چنانچہ اس اتمام حجت کے بعد حضرتؐ نے منذر بن عمرو کو بیس سے چالیس تک کی تعداد میں اور ایک روایت میں تو ستّر تک ان کا شمار بتایا گیا ہے مگر مؤرخ واقدی نے چالیس کو محقق قرار دیا ہے[۶]۔ خوش کردار حفاظ قرآن کی جماعت کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ لوگ روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک کنوئیں کے پاس جسے بئر معونہ کہتے تھے جا کر قیام کیا اور اپنے میں سے ایک صحابی رسولؐ حرام بن ملحان کو رسولؐ کا خط دے کر وہاں کے سردار عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ خط کا پہونچنا تھا کہ وہ آگ بگولا ہو گیا اور اُس نے خط پڑھنا بھی گوارا نہ کیا اور تمام عرب کے بین القبائلی دستور کے خلاف عامر نے

---

[۵] مرآۃ الجنان للیافعی مطبوعہ حیدرآباد دکن جلد ۱ صفحہ ۹

[۶] کتاب المغازی للواقدی مطبوعہ مطبع آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۹۶۶ء ج ۱ ص ۳۴۷

جھپٹ کر خود اُس قاصد کو قتل کر دیا اور اب اُس نے تمام بنی عامر کو اس جماعت کی خونریزی کی ترغیب دی مگر انھوں نے کہا کہ ہم ابو براء کی ضمانت کے خلاف نہیں کریں گے۔ تب اُس نے اُس پاس کے دوسرے قبائل عصیہ، اور رعل وغیرہ سے فریاد کی یہ اُس کی آواز پر جمع ہو گئے اور مسلمانوں کی اس جماعت کو وہیں جہاں وہ اُتری ہوئی تھی آ کر گھیر لیا۔ ان بہادروں نے تلواریں نیام سے نکالیں اور اُن سے جان توڑ مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ سب کے سب شہید ہو گئے۔ کوئی اتنا بھی نہ ہوتا جو اس کی اطلاع مدینہ تک پہونچاتا۔ وہ تو چراگاہ میں اُن کے مویشیوں کی حفاظت کے لئے دو آدمی عمرو بن امیہ ضمری اور حارث بن صمہ ان سے کچھ دُور رہ گئے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ طیور جو میدان جنگ میں کشتوں کی لاشوں پر جمع ہو جایا کرتے ہیں اُس سمت میں منڈلا رہے ہیں۔ اس سے انھیں پریشانی پیدا ہوئی اور وہ گئے کہ صورت حال معلوم کریں تو انھوں نے دیکھا کہ وہ سب خاک و خون میں آغشتہ پڑے ہوئے ہیں۔ اس پر عمرو نے کہا کہ ہمیں جا کر رسولؐ کو اس کی اطلاع دینا چاہیئے مگر حارث نے ساتھ جانے سے انکار کیا اور کہا میں تو اس سعادت کو نہیں چھوڑوں گا اور اسی قربان گاہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کروں گا۔ چنانچہ انھوں نے جنگ شروع کر دی اور دو کافروں کو قتل کر کے شہید ہو گئے۔

عمرو بن امیہ کو اُن لوگوں نے قید کر لیا۔[51] یہ صفر سنہ ۴ھ کا واقعہ ہے۔

علامہ طبرسی کا بیان ہے کہ عمرو بن امیہ ہی نے مدینہ جا کر حضرت پیغمبر خداؐ کو اِس سانحہ کی اطلاع دی۔[52] جس کا حضرتؐ کو بہت صدمہ ہوا اور تمام مسلمانوں پر اس اندوہناک واقعہ کا اثر ہوا اور یہ ایک بڑی اہم حقیقت ہے کہ اُس مجسّم ضبط و تحمل رسولؐ پر جس نے خود اپنے جسم پر پتھروں کی بارش ہونے پر کبھی دشمنوں کے لئے بد دعا نہ کی اِن بے گناہوں کے اس خونِ ناحق کا اتنا اثر ہوا کہ آپ نے ایک مدّت تک نماز کے قنوت میں ان قبائل پر جو اس ظلم و تشدد کے مرتکب ہوئے تھے نام بنام لعنت فرمائی۔[53]

جماعت یہود سے تصادم کا آغاز

اس کے پہلے حصّہ دوم میں یہ ذکر آچکا ہے کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ میں تشریف لانے کے بعد جماعت یہود نے آپ سے ایک معاہدہ کر لیا تھا جس کی رُو سے انھوں نے اُس حکومت اسلامیہ کے ساتھ جو رسولؐ کی سربراہی میں منجانب اللہ قائم تھی وفاداری کا اقرار کر لیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آئینی

---

[51] کتاب المغازی للواقدی ج ۱ ص ۳۴۸ [52] اعلام الوریٰ

[53] واقدی ج ۱ ص ۳۴۹، ص ۳۵۰

طور پر انھوں نے اس حکومت کو تسلیم کرتے ہوئے اُس کا رعایا ہونا قبول کر لیا تھا اس لئے ان کی حیثیت کسی مخالف قوم کی نہ تھی جن سے جنگ کا کوئی سوال ہوتا بلکہ اب یہ قلمرو مملکت اسلامی کے باشندہ ہونے کے بعد دستور کے رو سے خود اختیاری رضامندی کے ساتھ ایک طرح اس قوم کا جزء بنے ہوئے اس کی وفاداری کے پابند تھے لہٰذا اب اُن کی کسی خلاف ورزی پر جو کارروائی بھی ہو از اول تا آخر خواہ وہ بنی نضیر کی مہم ہو جو اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی ہے اور خواہ خیبر کی مہم ہو جو سب سے آخریں فیصلہ کن حیثیت سے وقوع میں آئی اُسے آج کل کی اصطلاح میں جنگ کہنا درست نہیں ہے تاکہ اُس میں دیکھا جائے کہ وہ مدافعانہ تھی یا جارحانہ بلکہ اُسے تادیبی مہم کہنا چاہیئے جسے عام زبان میں "پولیس ایکشن" کہتے ہیں اور وہ مجرموں کی سرکوبی یا اُن کی سزا کی حیثیت سے ہوتی ہے لیکن چونکہ قدیم محاورات میں مہمات کی اس تفریق کے لئے الفاظ نہ تھے۔ اس لئے مورخین جس طرح بدر و اُحد اور خندق کو غزوات کی لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اسی طرح وہ مجبور ہیں کہ ان مہمات کے لئے بھی "غزوۂ بنی نضیر" اور "غزوۂ بنی قریظہ" اور غزوۂ بنی المصطلق اور غزوۂ خیبر یا جنگِ خیبر کے الفاظ استعمال کریں اور چونکہ ان مہمات کا یہی اصطلاحی نام ہو گیا ہے لہٰذا ہم بھی آئندہ یہی الفاظ استعمال کریں گے لیکن اس فرق کو جس

پر یہاں بقدر ضرورت روشنی ڈالی گئی ہے پیش نظر رکھنا ان تمام مہمات میں ضروری ہے کہ ان غزوات یا جنگوں کی نوعیت وہ نہیں ہے جو بدر و اُحد وغیرہ کے غزوات کی ہے جن میں مخالف قوم کا مقابلہ تھا اور جن کے لئے بدلائل یہ حقیقت ثابت ہے کہ وہ ہمیشہ مدافعانہ طور پہ ہوئے ہیں اور کبھی رسولؐ کی جانب سے پیش قدمی کی صورت سے وقوع میں نہیں آئے۔

غزوۂ بنی نضیر

ان قبائل یہود میں سے ایک طاقتور قبیلہ وہ تھا جسے "بنی نضیر" کہا جاتا تھا۔ ان کا سردار کعب بن اشرف تھا۔

چونکہ اب تک بظاہر تعلقات پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں کے ساتھ خوشگوار تھے اس لئے رسولؐ کعب بن اشرف کے پاس ایک اسلامی مہم کے سلسلہ میں قرض لینے کے لئے تشریف لے گئے اس نے بظاہر آپ کا خیر مقدم کیا اور آپ سے بڑے تپاک کے ساتھ ملاقات کر کے آپ کو باتوں میں لگایا مگر دوسری طرف وہاں کے یہودیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ کی زندگی کے ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ تاریخ میں اُس شخص کا نام بھی درج کر دیا گیا ہے جو مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ایک پتھر کو لے جا کر اُس دیوار پر سے جس کے نیچے آپ تشریف فرما ہیں آپ کے سر پر لڑھکا دے۔ اور

وہ اُس پتھر کو لڑھکانے کے لئے اپنی جگہ سے حرکت بھی کر چکا
بس اب کیا ہوا ؟

علامہ طبرسی نے لکھا ہے :-

فنزل جبرئیل علیہ السلام فاخبرہ بما ھمّ بہ القوم من الغدر[1]۔ | جبرئیل امین اُترے اور اُنھوں نے آپ کو اطلاع دی کہ ان لوگوں نے آپ کے خلاف یہ منصوبہ بنایا

ابن خلدون نے بھی لکھا ہے :-

فاوحی اللہ بذلک الی نبیہ[2]۔ | اللہ نے بذریعۂ وحی اپنے پیغمبر کو اس کی اطلاع دی

بعض جدید اہل قلم بھی ایسا ہی لکھتے ہیں[3]۔

کہا جاتا ہے کہ کچھ اصحاب بھی اس موقع پر آپ کے ساتھ تھے آپ بغیر اُن سے کچھ کہے ہوئے اٹھے ، اس طرح جیسے ضرورت سے فارغ ہو کر واپس تشریف لائیں گے۔ اصحاب کافی دیر تک انتظار کرتے رہے۔ جب آپ واپس نہیں آئے تو اُنھیں تشویش ہوئی اور وہ دریافت حال کے لئے وہاں سے باہر نکلے اور آس پاس کے لوگوں سے پوچھا تو کسی نے کہا تو مدینہ کی طرف جارہے تھے۔ تب وہ اصحاب مدینہ آئے

---

[1] اعلام الوریٰ [2] تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص
[3] محمدؐ و بنو اسرائیل تالیف الدکتور مصطفٰے کمال وصفی ص ۸۲

کیا حضرتؐ سے سبب معلوم کیا۔ آپ نے اُن سے منصوبہ کی کیفیت بیان فرمائی۔

بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ اس موقع پر اُن کی جانب سے آپ پر قاتلانہ حملہ ہو گیا اور ایک بھاری پتھر گرا دیا گیا جس سے آپ بال بال بچے[۵]

اگر قدیم ماخذوں میں یہ روایت مل جائے تو کوئی شبہ نہیں یہ درایتہً اُس کا وزن کافی ہے۔

اُن کی اس حرکت کی پاداش میں حضرتؐ نے اُن کو مدینہ سے چلے جانے کا حکم دیا جسے اُنھوں نے پہلے منظور کر لیا مگر پھر رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی وغیرہ کے بھڑکانے سے انکار کر دیا اور کہا ہم اپنا قلعہ نہیں چھوڑیں گے آپ جو کر سکتے ہوں کیجیے[۶]

اب حضرتؐ اُن کی تادیب کے لئے مسلمانوں کی جماعت کو لے کر اور علم فوج حضرت علیؑ کو دے کر روانہ ہوئے اور اُن کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ وہ قلعہ بند ہو گئے اور اُن کی طرف سے تیراندازی بھی شروع ہو گئی چنانچہ ایک تیر خود حضرت پیغمبر خدا کے خیمہ میں آیا جس کی وجہ سے حضرتؐ کا خیمہ اُس جگہ سے ہٹا کر لگایا گیا۔ حضرت علیؑ ان تیراندازوں کی فکر میں رہے یہاں تک کہ آپ

---

[۵] تاریخ "مسلمانانِ عالم" حصہ اول صفحہ ۴۸ [۶] مدارج النبوۃ ج ۲ صفحہ ۲۰۳

نے دیکھا کہ اُن کا ایک مشہور تیر انداز جس کا نام عزورا تھا دوسر
دو پہلوانوں کے ساتھ ایک کمین گاہ سے برآمد ہوا اور یہ تینو
ہاتھوں میں تلواریں لئے ہوئے تھے۔ یہ دیکھتے ہی آپ نے حملہ ک
اور عزورا کو قتل کرکے اُس کا سر حضرت کے پاس لائے۔ ابو
وغیرہ نے دوسرے اُس کے ساتھیوں کو قتل کیا۔ پھر قلعہ میں
کوئی باہر نہیں نکلا۔ بہر حال اُن کے اس سرکشی کے تیور
کو دیکھ کر حضرت نے محمد بن مسلمہ کے ذریعہ سے اُن کو کہلوایا کہ
تین دن کی مہلت دی جاتی ہے اس تین دن کے اندر وہ مد
سے باہر نکل جائیں[۱] اُنھوں نے اب خوب سمجھ لیا تھا کہ وہ عرصہ تک
مقابلہ نہیں کرسکتے اس لئے اب وہ سر تسلیم خم کرنے کے
مجبور ہوگئے اور مدینہ سے جلاوطن ہوکر خیبر میں جا کر آباد ہو
یہ ہجرت کے چھتیس ۳۶ مہینے کے بعد ربیع الاول ۴ھ کا واقعہ

فدیۂ اسلام کی پیدائش

اسی سال ۳ شعبان کو حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہ
یہاں پیغمبر اسلام کے چھوٹے نواسے کی پیدائش ہوئی جس کا
حسینؑ رکھا گیا۔ دنیا کو اس وقت چاہے خبر نہ ہو مگر مستقبل
اُٹھائے گا تو سب ہی کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ پیدا ہوئے

---

[۱] اعلام الوریٰ
[۲] اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۲۱۱

صرف علیؑ کا فاطمہؑ کا فرزند اور رسولؐ کا نواسہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ اپنے نانا کے قائم کئے ہوئے اس دین کی قیامت تک کے لئے بقا کا ذریعہ بننے والا ہے۔ اس لئے اس کی پیدائش تاریخ اسلام کے ایک اہم باب کی سُرخی ہے جس کا مضمون سنہ ۶۱ھ میں ریگ زار کربلا میں بہتے ہوئے اس کے خون کی روشنائی سے معرض تحریر میں آئے گا۔

غزوۂ بدرُ الموعِد

اس کے پہلے جنگ اُحد کے حال میں آچکا ہے کہ مشرکین کی طرف سے یہ اعلان ہوا تھا کہ اب آیندہ سال بدر کے مقام پر ہم سے تم سے پھر مقابلہ ہوگا۔ اس کو رسالت مآبؐ نے بھی منظور فرمایا چنانچہ اس قرارداد کے مطابق بروایتے یکم ذیقعدہ کو ہجرت سے ۴۵ مہینے کے بعد[1] اور دوسری روایت کے لحاظ سے ماہ شعبان ہی میں[2] رسولؐ نے علم لشکر حضرت علی بن ابی طالبؑ کو دیا[3] اور لشکر اسلام کے ساتھ باہر نکل کر بدر میں ایک ہفتہ تک قیام فرمایا اور اُدھر سے ابوسفیان بھی اہل مکہ کی فوج لے کر شہر سے نکلا۔

غالباً اس تصوّر میں کہ جنگ اُحد کی ہولناک صورت حال کے بعد اب مسلمانوں کو باہر آنے کی ہمّت نہیں رہی ہوگی اور ہم اس طرح

---

[1] المغازی للواقدی صہ ۳۸۴
[2] اعلام الوریٰ
[3] واقدی صہ ۳۸۴ مدارج النبوۃ مطبوعہ لکھنؤ ج ۲ صہ ۲۰۵

مفت کی ایک فتح حاصل کرلیں گے اُس نے یہ اقدام کیا تھا مگر شہر سے باہر آنے کے بعد جب اُسے مخبروں سے یہ اطلاعیں ملیں کہ پیغمبر مسلمانوں کی فوج کو ساتھ لئے جنگ پر تیار باہر نکل چکے ہیں تو مقام ظہران تک پہونچ کر اُس نے ارادہ بدل دیا اور اپنی فوج کو لے کر واپس چلا گیا۔

یہاں بدر کے قریب ایک بازار لگتا تھا، وہ لگ گیا اور پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے اصحاب نے اس بازار میں تجارتی صورت سے شرکت فرما کر خرید و فروخت میں حصّہ لیا جس سے اچھی منفعت حاصل ہوئی[۱۵]

اس کے بعد رسالت مآبؐ سولہ[۱۶] دن کے بعد فاتحانہ طور پر مدینہ واپس تشریف لے گئے[۱۶]

غزوہ مُرَیسیعُ
یا
بنی مُصطلِق

یہ دوشعبان ۵ھ میں ہوا ہے[۱۷] قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ تھی جس نے حملہ کے لئے مدینہ کا رُخ کیا تھا تو حضرتؐ نے باہر نکل کر مریسیع کے پاس جو ایک کنواں تھا اُن سے مقابلہ کیا[۱۸] سردار اُن کا

---

۱۵ اعلام الوریٰ
۱۶ واقدی ص ۳۸۴
۱۷ مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۱۱
۱۸ اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۲۱۹

حارث بن ابی ضرار تھا۔

فوج اسلام کے آنے کی دہشت سے اُس قبیلہ کے ساتھ جو دوسرے لوگ اِدھر اُدھر کے کثرت سے جمع ہو گئے تھے سب منتشر ہو گئے اور بس حارث اور اُس کے قبیلے والے رہ گئے جو مقابلے پر تیار ہوئے۔

پیغمبر خدا نے مسلمانوں کو اُن پر اجتماعی طور سے حملہ کرنے کا حکم دیا جس کے نتیجے میں ایک بھی آدمی اُن میں سے بھاگ نہیں سکا بلکہ دس آدمی قتل ہوئے اور باقی سب قید کر لئے گئے۔

غزوۂ احزاب
یا
جنگ خندق

مشرکین مکہ اپنی انفرادی طاقت کو پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں اب قطعی طور پر ناکافی سمجھ چکے تھے۔ اس لئے کہ بدر میں جب مسلمان بالکل ہی بے سروسامان تھے تو اُن کی تعداد میں تگنی مسلح فوج نے اُن کے مقابلہ میں ایسی شکست کھائی کہ جتنے اُن کے بڑے بڑے چوٹی کے آدمی تھے تقریباً سب مار ڈالے گئے۔ پھر وہ پوری طاقت کے ساتھ جب اُحد میں آئے تو اُنھوں نے یہ دیکھ لیا کہ وہ فوج اسلام کی اکثریت کو میدان سے پسپا کر دینے کے بعد بھی آخر کار جنگ کو سر نہ کر سکے اور جتنے اُن کی فوج کے علمدار تھے

وہ تو سب ہی کام آ گئے۔ اب اس کے بعد بس یہ ایک صورت باقی تھی کہ وہ دوسری جماعتوں کو جو اسلام کی مخالفت میں اُن کے ساتھ شریک ہو سکتی ہیں اپنے ساتھ شریک کرکے متحدہ طاقت کے ساتھ پیغمبرؐ کا مقابلہ کریں۔

اس میں اُنھیں یہود کی اُس جماعت سے جو مدینہ میں تھی فطری طور پر مدد ملنے کی اُمید پیدا ہونا ہی چاہیئے تھی اُس تلخی کی وجہ سے جو بنی نضیر کی جلاوطنی سے پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ حیی بن اخطب سلام بن ابی حقیق اور کنانہ بن ربیع اور سلام بن مشکم وغیرہ سرداران یہود خود مکہ پہونچ گئے اور سرداران قریش سے مل کر اُنھیں متفقہ طاقت کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لئے آمادہ کیا[۱]

عبدالباری صاحب ایم۔اے نے معیّناً اس غزوہ کی تاریخ ۸ ۲ ذیقعدہ ۵ھ درج کی ہے[۲]۔ مگر بعض مورخین اس معرکہ کو ذیقعدہ کے بجائے شوال میں بتلاتے ہیں[۳]۔

خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری نے ذیقعدہ ۵ھ کے ساتھ لکھا ہے:۔ "مارچ۔ اپریل ۶۲۷ء"[۴]

خیر یہ تو صرف مہینہ کا اختلاف تھا مگر علامہ ابن خلدون نے

---

[۱] ابن خلدون ص۲۷ و اعلام الوریٰ

[۲] دعوت دہلی "سیرت طیبہ" نمبر ۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ ص ۱۸۳

[۳] اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۲۲۲ [۴] اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ ج ۱ ص ۱۹۵

تو اُلٹی چھلانگ لگا کر ایک دم اس واقعہ کو ایک سال قبل پہونچا دیا ہے وہ یہ لکھنے کے بعد کہ یہ شوال ۵ھ میں ہوا ہے کہتے ہیں کہ:- والصحیح انفا فی الرابعۃ "صحیح یہ ہے کہ وہ ۴ھ میں ہوا ہے" دلیل میں جناب عبداللہ بن عمر کا قول نقل کیا ہے کہ اُحد میں میں چودہ برس کا تھا رسولؐ نے مجھے واپس کر دیا کہ یہ نابالغ ہے۔ خندق میں مجھے اجازت دے دی کہ اُس وقت میں پندرہ برس کا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُحد اور خندق کے درمیان صرف ایک سال کا فرق ہے[۱]۔ لیکن یہ استدلال نہ زیادہ وزن نہیں رکھتا اور زیادہ دقیع مستند یہی بتاتے ہیں کہ یہ غزوہ ۵ھ میں ہوا ہے[۲]

علامہ طبرسی کا بیان ہے کہ یہی یہودی لیڈر جن کے نام پہلے آچکے ہیں غطفان اور کنانہ کے سرداروں کے پاس بھی گئے اور اُنھیں بتایا کہ قریش کو ہم نے پورے طور پر آمادہ کر لیا ہے۔ اب تمھارے ساتھ دینے کی ضرورت ہے چنانچہ یہ لوگ بھی اس کے لئے تیار ہو گئے[۳]

مکہ سے قریش کا لشکر ابو سفیان کی قیادت میں نکلا۔ قبیلۂ غطفان کی قیادت عیینہ بن حصین بنی فزارہ کی معیت میں کر رہا تھا۔ بنی مرہ کو لے کر حارث بن عوف اور قبیلۂ اشجع کے ساتھ

---

[۱] تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۳۵
[۲] مروج الذہب للمسعودی ط مصر ج ۲ ص ۱۸۳ [۳] ص ۵۳ اعلام الوری

دبرة بن طریف ـــ یہود کا کوئی لشکر ان کے ساتھ نہ تھا مگر منصوبہ یہ تھا کہ وہ مدینے کے اندر سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ اس طرح مسلمان چکّی کے دو پاٹوں کے بیچ میں پس کر رہ جائیں گے۔

پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تک یہ پوری خبر پہونچی اور تمام منصوبہ کی اطلاع ہوئی۔ اس موقع پر باجماع مؤرخین جناب سلمان فارسی نے رائے دی کہ دشمنوں کے لئے رکاوٹ پیدا کرنے کے لئے خندق کھود دی جائے[1]

مگر اس خندق کی نوعیت کیا تھی؟ اس پر جب غور کیا جاتا ہے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مدینہ منورّہ کئی طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس لئے مکّہ معظمہ سے جو فوج آئے گی وہ بس ایک ہی طرف سے شہر میں داخل ہو سکتی تھی لہٰذا جناب سلمان کی رائے سے اس سمت میں جدھر سے فوج کے داخل ہونے کا اندیشہ تھا ایک وسیع خندق کھود دی گئی جسے فوج مخالف کے سوار اور پیادے ایک دم عبور نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب لوگ بسلسلۂ حج زیارت مدینہ منورہ کے لئے جاتے ہیں تو اُن کو دوسری زیارتوں کے ساتھ وہ جگہ بھی دیکھنے کا موقع ملتا ہے جہاں جنگ خندق ہوئی تھی اور اُس خندق کا نشان اب بھی دُور تک نظر آتا ہے۔

---

[1] المغازی للواقدی ص۴۴۵

واقدی نے تو خندق کے حدود بھی لکھ دیے ہیں کہ وہ مذاد سے ذباب تک اور پھر راتج تک تھی۔ حاشیہ پر اس کی تشریح درج ہے کہ مذاد بنو سلمہ کی ایک شاخ کا مملوکہ ٹیلا تھا جو مسجد فتح کے مغرب میں تھا (وفاء الوفا ج ۲ ص ۲۷۰) راتج وہ پہاڑی تھی جو کوہ بنی عبید کے پہلو میں لطحان کے مغرب میں واقع تھی (وفاء الوفا ج ۲ ص ۲۳۱)"۔ اس سے نوعیت خندق کی وہی ثابت ہوتی ہے۔ جو ہم نے ابھی لکھی ہے مگر مسٹر کے۔ اے حمید لکھتے ہیں کہ:-

"سلمان فارسی نے سرکار کے روبرو تجویز پیش کی کہ ایران میں ایسے خطرناک موقعوں پر شہر کے گرد خندق کھود دیتے ہیں کہ دشمن اسے عبور کر کے شہر میں داخل نہ ہو سکے سرکار کو یہ تجویز پسند آئی۔ چنانچہ مدینہ کے اردگرد ایک عمیق خندق تیار کی گئی[۱]"

"مدینہ کے اردگرد" کے جو معنی عام طور پر ذہن میں آتے ہیں، ویسی "عمیق خندق" اگر تیار کی گئی ہوتی تو تمام مسلمانوں کے اس میں لگ جانے کے بعد بھی پہاڑی علاقہ کی سنگلاخ زمین میں یہ چند مہینے سے کم کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہ واقعہ کے قطعاً خلاف معلوم ہوتا ہے اور اگر ایسا ہوتا تو مشرکین کے مکہ سے نکلنے کے پہلے یہ کام شروع ہو چکا ہوتا جس کی انھیں پہلے سے اطلاع ہو گئی ہوتی

---

[۱] تاریخ "مسلمانانِ عالم" حصہ اول ص ۷۹

حالانکہ جیسا بعد میں آئے گا، واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے وہاں پہونچتے ہی پر یہ دیکھا کہ خندق کھدی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ وہیں پر رک گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خندق بس چند دن کی محنت میں مشرکین کے مکّہ سے نکلنے کے بعد ہی تیار ہوئی تھی۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا اس جنگ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ ذیقعدہ میں ہوئی اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ ماہِ شوال میں ہوئی ہے۔ غالباً دوسرے قول کی بنا پر یہ امر قرینِ قیاس ہو سکتا ہے کہ خندق کے کھودے جانے کا کام ماہ صیام کی آخری تاریخوں میں ہوا ہو جیسا کہ تفاسیر سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت :-

احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم ھن لباس لکم وانتم لباس لھن علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم فالآن باشروھن وابتغوا ما کتب اللہ لکم وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود

تمھارے لئے جائز کیا گیا ہے روزہ کی رات میں اپنی عورتوں سے مقاربت کرنا وہ تمھاری پوشاک ہیں اور تم اُن کی پوشاک ہو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنی ذات کے ساتھ غداری کرتے رہے ہو تو اب اُس نے تمھاری توبہ قبول کی اور تمھیں معاف کر دیا ہے تو اب تم اُن سے مقاربت کرو اور جو کچھ اللہ نے تمھاری تقدیر میں لکھا ہے اُسکے طلبگار رہو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح سفید ڈورا کالے ڈورے سے الگ ہو کر

من الفجر ثم اتموا الصیام الی اللیل (بقرہ آیت ۱۸۷) | لگتا دے نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ کو پورا کرو۔

انہی دنوں میں نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ میں نے تفسیر قرآن پارہ دوم میں لکھا ہے: "ابتدائے اسلام میں یہ حکم تھا کہ ماہ مبارک رمضان میں راتوں کو بھی عورت سے مخصوص تعلقات کا قائم کرنا جائز نہ تھا۔ اکثر مسلمان چوری چھپے اس حکم کی مخالفت کرتے تھے۔ اس آیت میں خالق نے اُس حکم کو منسوخ فرمایا اس طرح کہ اُن کے گزشتہ کردار پر سرزنش بھی فرمائی اور پھر آئندہ کے لئے معافی کا اعلان بھی کر دیا الفاظ قرآن میں اس حکم کے ساتھ صرف صراحت قبل والے حکم کے منسوخ کرنے کی ہے مگر دوسرے حکم میں الفاظ سے اس کی صراحت نہیں نکلتی۔ روایت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی ابتدائے اسلام میں ایک حکم تھا کہ ماہ رمضان المبارک میں جب آدمی سو جائے تو پھر کچھ کھانا پینا جائز نہیں رہتا تھا۔[1]

اس حکم کو بھی اس آیت میں منسوخ کیا گیا مگر اس منسوخی کے ساتھ کوئی سرزنش نہیں ہے اس لئے کہ کسی نے اُس کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ ایک صحابی رسولؐ نے جن کا نام بعض روایات میں خوات بن جبیر ہے اور بعض میں مطعم بن جبیر جنگ خندق میں اتفاق سے درمیان میں سو جانے کی وجہ سے بے روزہ پر روزہ رکھ لیا اور پھر خندق

---

[1] تفسیر مجمع البیان پارہ دوم

کھودنے میں مصروف ہوگئے، یہاں تک کہ غش آگیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور وہ حکم برطرف کیا گیا۔

دوسرے مسلمانوں کے ساتھ خود حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی خندق کھودنے میں مصروف تھے اس عالم میں کہ بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔[۱]

ایک خیال یہ ہے کہ اس ضعف وناتوانی کی شدت کا سبب اس پوری جماعت کے لئے قحط کی وجہ سے مسلسل فاقہ کشی بھی تھی چنانچہ خواجہ محمد لطیف صاحب لکھتے ہیں :۔

"اس واقعہ کے مہینوں پہلے سے مدینہ میں قحط تھا۔ خرمے کی پوری فصل تباہ ہوگئی تھی۔ خوراک کی کمی تھی کفار کے حملہ کی وجہ سے بیرونی رسد کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ مسلمانوں پر فقر وفاقہ کی کیفیت طاری تھی۔ اس پر تیز وتند ہوا چل رہی تھی۔ ابر وباراں بھی تھا دن دن بھر پتھریلی زمین کا کھودنا، بڑے بڑے دلیروں کے کلیجے ہلے جارہے تھے۔"[۲]

بعض روایات کے مطابق یہی موقع پر خندق کھدنے کا وہ ہے جب حضرت پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب سلمان فارسی رضوان اللہ علیہ کو وہ بیش بہا سند عطا فرمائی جس کا فخر صحابۂ رسول

---

[۱] مدارج النبوۃ ج ۲ صـ۲۲۸ [۲] اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول صـ۱۱۱ تا صـ۱۱۲

میں سے کسی دوسری فرد کو حاصل نہیں ہوا۔ چونکہ جناب سلمان رضؓ بہت سے اہل الرائے کی طرف رائے دے کر بری الذمہ نہیں ہو گئے بلکہ جب اس پر عمل ہوا اور پیغمبر خدا نے چالیس چالیس گز زمین دس دس آدمیوں کے ذمہ کی تو جناب سلمان خود بھی خندق کھودنے والوں میں شریک ہوئے اور باوجود اپنی اس عمر طویل کے جس کا شمار بعض راویوں نے سیکڑوں کے حساب سے کیا ہے۔ وہ قوی ہیکل ایسے تھے اور پھر عزم و قوت ارادی اور اس سے بالاتر قوت ایمانی ایسی رکھتے تھے کہ جتنا کام دس آدمی مل کر کرتے تھے اتنا وہ اکیلے کر لیتے تھے تو مہاجرین اور انصار میں اُن کے اپنانے میں مقابلہ ہونے لگا۔ مہاجرین کہنے لگے کہ سلمان ہم میں سے ہیں۔ (کیونکہ وہ مدینہ کے باشندہ نہیں تھے۔ باہر ہی سے آئے تھے) اور انصار نے کہا، نہیں۔ سلمان ہم میں سے ہیں (کیونکہ مہاجرین تو وہ ہیں جو مکہ سے ترک وطن کر کے آئے ہیں اور اُن میں جناب سلمان داخل نہیں ہیں) اس بحث کو سُن کر پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔ سلمان منا اهل البیت" سلمان ہم اہل بیت میں سے ہیں[1]

علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں آیت: قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء و

---

[1] مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۲۳۰

وتعزّ من تشآء وتذلّ من تشآء بیدک الخیر اس روایت کو درج کیا ہے اور اسے علامۂ نوری نے حالات جناب سلمان میں نقل کیا ہے[۱]۔

مشرکین کی فوجیں مدینے کے قریب پہونچیں تو سامنے خندق کھدی ہوئی پاکر اسی خندق کے کنارے پر صف آرا ہوگئیں اور ادھر سے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی فوج کے ساتھ خندق کے اس طرف مقیم ہوگئے۔ بیس دن سے زیادہ دونوں طرف کے مورچے جمے رہے مگر سوا تیر اندازی اور سنگ باری کے کسی جنگ کی نوبت نہیں آئی[۲]۔

بنی قریظہ کی عہد شکنی

یہ پہلے آچکا ہے کہ وہ یہودی جو مدینے سے باہر نکالے جاچکے تھے اس جنگ کے اصل محرک تھے اور تمام مخالف اسلام عناصر کی یہ جتھہ بندی انہی کی کوشش سے ہوئی تھی مگر مدینہ میں ابھی جو اُن کا قبیلہ بنی قریظہ نام کا باقی تھا وہ ابھی تک اپنے معاہدہ دوستی پر بظاہر قائم تھا اس لئے ایک حد تک مسلمانوں کو مدینہ کی اندرونی حالت سے اطمینان تھا مگر باہر کے یہودیوں نے کوشش شروع کردی کہ انھیں بھی وہ رسولؐ کی مخالفت پر آمادہ کریں اور انھوں نے مشرکین کو پہلے ہی اس کا اطمینان دلایا تھا کہ تم ادھر سے حملہ کرو تو ہم ذمہ دار ہیں کہ مدینے کے اندر کے یہودی بھی تمھارا ساتھ دیں

---

[۱] نفیس الرحمٰن، ط ایران ص۳۱

[۲] اعلام الوریٰ

گے جن میں ساڑھے سات سو جنگ آزما سپاہی موجود ہیں۔

اس بنا پر جب مکہ سے لشکر روانہ ہوا اور مدینے کے قریب پہونچا تو ابوسفیان نے بنی نضیر کے سردار حیی بن اخطب کو وہ وعدہ یاد دلایا اور کہا کہ اب تم مدینہ میں جاکر بنی قریظہ کو تیار کرو اور اُن سے اُس معاہدہ کے توڑنے کا اعلان کرادو جو اُن میں اور رسولِ خداؐ میں ہو چکا تھا کہ جب مدینہ پر کوئی حملہ کرے گا تو مدینے کے یہودی شہر کی حفاظت کی مہم میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے[1] چنانچہ حیی بن اخطب خفیہ طریقہ پر مدینہ گیا اور کعب بن اسد کے پاس جاکر جو بنی قریظہ کا سردار تھا اُسے عہد شکنی پر آمادہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ پہلے تو کعب نے اُس کے اس منصوبہ کا اندازہ کرکے اُس سے ملنے سے بھی انکار کر دیا مگر وہ کسی طرح نہ ٹلا۔ آخر میں اُس سے ملاقات کی اور قریش اور اُن کے ساتھیوں کی طاقت کا ایسے مبالغہ آمیز طریقہ پر تذکرہ کیا اور اپنی کامیابی کے ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ بالآخر اُس کے کہنے میں آگیا اور وہ تحریر منگوا کر جو حضرت پیغمبر خداؐ کے ساتھ معاہدہ کی دستاویز کے طور پر لکھی گئی تھی حیی نے اپنے ہاتھ سے چاک کر دی اور باہر آکر تمام بنی قریظہ میں اِس کا اعلان کر دیا[2]

بعض افراد فطری حیثیت سے وہ ہوتے ہیں جنھیں دہشت ناک

---

[1] المغازی للواقدی ص۳۵۳ [2] واقدی ص۳۵۶

خبریں پہونچانے کا خاص ذوق ہوتا ہے جو خود اُن کی ایک خاص قلبی کیفیت کا ترجمان ہوتا ہے چنانچہ واقدی نے لکھا ہے :-

بینا رسولُ اللهؐ والمسلمون فی الخندق اتی عمر بن الخطاب الی رسول اللهؐ وھو فی قبته فقال یا رسولُ الله بلغنی ان بنی قریظة قد نقضت العھد وحاربت فاشتد ذالک علی رسول الله صلی الله علیه وسلم

اس دوران میں کہ جب رسول خداؐ اور دیگر مسلمان خندق میں تھے (خلیفہ ثانی) عمر بن خطاب رسول خداؐ کے پاس آئے جب کہ آپ اپنے خیمہ کے اندر تھے اور کہا یا رسول اللہؐ مجھے اطلاع ملی ہے کہ بنی قریظہ نے معاہدہ توڑ دیا اور برسر جنگ ہوگئے ہیں — یہ خبر پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہت شاق گزری۔

حضرت نے کسی کو تحقیق حال کے لئے بنی قریظہ کی طرف بھیجنا چاہا تو انھوں نے ہی رائے دی کہ زبیر کو بھیجئے چنانچہ زبیر جا کر حالات کا مشاہدہ کرکے واپس آئے اور بتایا کہ وہاں قلعہ کی حفاظت کے سامان ہو رہے ہیں اور لڑائی کی تیاری ہو رہی ہے۔

اب حضرتؐ نے انصار میں سے سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ، اور اسد بن حضیر ایسے ممتاز افراد کو بلا کر انھیں اس کی اطلاع دی چونکہ یہ مدینہ کے معزز باشندہ ہونے کے لحاظ سے زمانہ قدیم سے رؤساء یہود کے ساتھ برابر کے تعلقات رکھتے تھے۔ بالخصوص

جناب سعد بن معاذ کے اُن سے بڑے گہرے روابط تھے اس لئے حضرتؐ نے اُن کو منتخب فرمایا کہ یہ اُن سے جا کر بات چیت کریں اور صاف صاف اُن کا عندیہ معلوم کریں ۔۔ تاریخ کا بیان ہے کہ حضرتؐ نے اُنھیں ہدایت فرمائی کہ اگر یہ بات کہ وہ برسر مخالفت ہیں غلط ثابت ہو تو آکر صاف صاف اعلان کر دینا ورنہ ایسے الفاظ میں کہنا کہ عام لوگ اُسے سمجھ نہ سکیں۔ چنانچہ وہ لوگ گئے اور گفتگو کی کوشش کی مگر اُدھر سے بجائے کسی سنجیدہ گفتگو کے فحش کی گالیوں سے ان کی تواضع کی گئی اور سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ ایسے معززین کو مغلظات گالیوں کے سننے کا تجربہ ہوا۔ مجبوراً یہ حضرات واپس آئے اور خاص رمزی الفاظ میں حضرت پیغمبر خدا تک حقیقت واقعہ پہونچائی تاکہ عام مسلمانوں کو اس خبر کے سننے سے ہمت پست نہ ہو۔ مگر ایسی خبر جو اتنے آدمیوں میں گردش کر چکی ہو راز کہاں رہ سکتی ہے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ہر ایک اپنے مخصوص آدمیوں سے اس طرح کہتا ہے کہ دیکھو یہ راز ہے ظاہر نہ ہونے پائے۔ پھر اُن میں سے ہر ایک نے اپنے مخصوص شخص یا اشخاص سے کہا۔ اس طرح

کجا ماند نہاں رازے کزو سازند محفلہا

رفتہ رفتہ وہ خبر بالکل عام ہو جاتی ہے چنانچہ یہی ہوا کہ دوسرے ہی دن سارے مسلمانوں میں یہی چرچا تھا اور اب

مسلمانوں کے خوف و دہشت کا وہ عالم تھا جس کا اظہار ہمارے لئے تو اپنے الفاظ میں ممکن بھی نہ تھا اور شائد کچھ لوگ اُسے معاذ اللہ پر بھی مبنی سمجھتے کہ بھلا "غازیانِ اسلام" اور اُن کا یہ عالم! مگر کیا کیا جائے کہ قرآن مجید اپنے معجز الفاظ میں اُس کی پوری عکاسی کر رہا ہے:-

مجاہدینِ اسلام کا عالم :-

سورۂ احزاب میں ارشاد ہوتا ہے:-

اذ جآءوکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا ھنالک ابتلی المومنون وزلزلوا زلزالا شدیدا (آیت ۱۰ و ۱۱)

وہ عالم یاد کرو جب دشمن تمھارے اوپر سے آئے اور تمھارے نیچے کی جانب سے اور جب تمھاری آنکھیں پھر گئیں اور دل منہ کو آ گئے تھے اور تم اللہ کی نسبت طرح طرح کی بدگمانیاں کر رہے تھے یہ موقع مسلمانوں کے لئے بڑا آزمائش تھا اور وہ سخت زلزلہ سے تہ و بالا ہو رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ دو ایک آدمیوں کی یہ حالت ہو تو وہ اس طرح بیان کرنے کی مستحق بھی نہیں ہو سکتی۔ انداز کلام بتا رہا ہے، کہ مسلمانوں کا عام طور پر عالم یہی تھا جس سے بری بس کچھ مستثنے اکا دکا ہی ہو سکتی ہیں۔ واقدی نے لکھا ہے:-

فکان ابوبکر الصدیق یقول "لقد خفنا علی الذراری بالمدینة من بنی قریظة اشد من خوفنا من قریش وغطفان ولقد کنت اوفی علی سلع فانظر الی بیوت المدینة فاذا رائیتھم ھادئین حمدت اللہ عزوجل

حضرت ابوبکر کا بیان تھا کہ ہمیں اب سامنے والے دشمن سے زیادہ اپنے اہل وعیال کے لئے جو مدینہ میں تھے بنی قریظہ سے خوف ہوگیا تھا اور میں سلع پہاڑی پر چڑھ چڑھ کے مدینہ کے مکانوں پر نظر ڈالتا تھا اور جب وہاں سکون پاتا تھا تو خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔

اب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے ساتھ نے مسلمان تو خندق کے پاس سے ہٹ کر جا نہیں سکتے تھے اُن دشمنوں کی وجہ سے جو سامنے صف آرا تھے۔ لہٰذا آپ نے سلمہ بن اسلم اشہلی کو دو سو آدمیوں کے ساتھ اور زید بن حارثہ کو تین سو آدمیوں کے ساتھ مقرر کیا کہ وہ دو جانب سے مدینہ کی طرف صدائے تکبیر بلند کرتے ہوئے جایا کریں تاکہ گھروں میں رہنے والے مسلمانوں کو اُس سے ڈھارس ہو اور دشمن محسوس کریں کہ یہ بے سہارا نہیں ہیں۔ ظاہری اسباب میں یہ تدبیر وہ تھی جس سے بنی قریظہ کو اندر سے حملہ کرنے کی ہمّت نہ ہوئی۔[1]

---

[1] کتاب المغازی للواقدی ص۲۶۰

روئداد جنگ مستند مؤرخین کے بیانات کی روشنی میں یہ پتہ چلتا ہے کہ جنگ خندق باعتبار اپنی روئداد کے نام ہے صرف ایک فرد یعنی حضرت علی بن ابی طالبؑ کے کارنامہ کا جس کی تفصیل ابھی آپ کے سامنے آئے گی۔

مسٹر کے۔ اے حمیدی، اے (لندن) بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور جنھوں نے تاریخ اس صفت سے لکھی ہے کہ حتی الامکان حضرت علی بن ابی طالبؑ کا کوئی کارنامہ نمایاں نہ ہونے پائے، اُنھیں بھی ضمیر کے دباؤ سے آپ کا نام تو لینا پڑا ہی ہے مگر اُنھوں نے روئداد جنگ کو اجمال کے پردہ میں چھپا کر آپ کی اُس انفرادیت پر پردہ ڈالا ہے جس کا نمایاں ہونا جنگ کی واقعی روئداد لکھنے کی صورت میں یقینی تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"بیس دن تک دشمنوں نے مدینہ کا محاصرہ رکھا لیکن باوجود انتہائی کوشش کے وہ شہر میں داخل نہ ہو سکے فرداً فرداً لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں کبھی کفار کامیاب ہوتے، کبھی مسلمان۔ حضرت علی نے مردانگی کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ قریش دنگ رہ گئے"[1]

اسے انھوں نے غالباً شاہ عبدالحق کے یہاں سے لیا ہے۔ اُنھوں نے بھی روئداد جنگ خندق کچھ اسی انداز سے لکھی ہے۔

---

[1] مسلمانانِ عالم حصہ اول ص۹۷

چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں :

"مشرکاں می آمدند وقصد خیمہ آں حضرت مے کردند ، لیکن مجال نداشتند کہ از خندق بگزرند ۔ القصہ محاربہ و مقاتلہ بیاں دو لشکر واقع شد خصوصاً از علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ دریں غزا مبارزہ ہا و مقاتلہ ہا واقع شد از حد قیاس بیروں چنانکہ در اخبار وارد شدہ است لمبارزۃ علی بن ابی طالب یوم الخندق افضل من اعمال امتی الی یوم القیامۃ کذا فی روضۃ الاحباب"[1]

مشرکین آتے تھے اور آنحضرتؐ کے خیمہ تک پہونچنے کا قصد کرتے تھے لیکن اُنھیں ممکن نہیں ہوتا تھا کہ خندق کو پار کریں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دونوں فوجوں میں جنگ و پیکار وقوع میں آئی خصوصیت کے ساتھ حضرت علی مرتضےٰ سے اس جنگ میں ایسے ایسے مقابلے ہوئے اور لڑائیاں وقوع میں آئیں جو تصور کی حدود سے باہر ہیں جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ علی بن ابی طالب کی جنگ بروز خندق قیامت تک کے میری امت کے اعمال سے بہتر ہے ۔ ایسا ہی روضۃ الاحباب میں مذکور ہے ۔

مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب مسلمانوں کا لشکر خندق کے ادھر تھا ، یہ اسے پار کر کے اُدھر نہیں جا سکتا تھا ، اور مشرکین کا لشکر اُدھر تھا ، وہ اُسے پار کر کے ادھر نہیں آسکتا تھا تو فرداً فرداً لڑائیاں یا دونوں لشکروں میں "محاربہ و مقاتلہ" کوئی بھی

---

[1] مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۳۳ و ۲۳۴ ۔

صورت ہوئی کیونکر؟

میری جہاں تک قدیم ماخذوں پہ نظر ہے مجھے وقتاً فوقتاً تیراندازی و سنگباری کے علاوہ جس کی نوعیت وہی تھی جیسے اس وقت نہر سویز کے ادھر اور اُدھر سے آج کل مصر اور اسرائیل کے درمیان اکثر گولہ باری کا تبادلہ ہو جایا کرتا ہے، باقی فرداً فرداً "لڑائیاں" کیسی، اس دوران میں ایک لڑائی یا "مابین دو لشکر" کسی بھی محاربہ و مقاتلہ کے وقوع کا پتہ نہیں ملتا بلکہ مورخین نے تصریح کی ہے کہ خندق کے بیچ میں حائل ہونے کی وجہ سے کسی جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ چنانچہ ابن الوردی نے لکھا ہے :-

اقام المشرکون بضعا وعشرین لیلۃ ورسول اللہ مقابلهم ولیس بینهم قتال غیر المراماۃ بالنبل ثم خرج عمرو بن عبد ود[1]

مشرکین نے بیس شب روز سے زیادہ قیام کیا اور رسول خدا ان کے مقابلے میں رہے اور ان کے درمیان اس عرصہ میں کوئی جنگ نہ ہوئی سوا تیر اندازی کے۔ پھر عمرو بن عبد ود میدان میں نکلا۔

ابن خلدون تحریر کرتے ہیں :-

دام الحصار علی المسلمین قریبا من شہر ولم تکن

مسلمان ایک مہینے کے قریب محصور رہے اور کسی جنگ کی نوبت نہیں

[1] تاریخ ابن الوردی ج ۱ ص ۱۲۳

maablib.com

حرب ــــ وتمادی الامر
وظهر فوارس من قریش
الی الخندق فیهم عکرمة
بن ابی جهل وعمرو
ابن عبد ود۔ [1]

آئی ــــ اور اس سلسلہ نے طول
کھینچا یہاں تک کہ کچھ شہسوار
قریش کے خندق سے اس طرف
آگئے جن میں عکرمہ بن ابی جہل اور
عمرو بن عبدود (وغیرہ) سے بھی

اسماعیل ابوالفدا کے بالکل وہی الفاظ ہیں جو ابن الوردی
کے تھے [2]

طبری رقم طراز ہیں :۔

فاقام رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم واقام
المشرکون علیہ بضعا
وعشرین لیلۃ قریبا
من شهر ولم یکن بین القوم
حرب الا الرمی بالنبل و
الحصار۔ [3]

تو حضرت پیغمبر خدا نے قیام فرمایا
اور مشرکین بھی قیام پذیر رہے
بیس شب و روز سے زیادہ تقریباً
ایک مہینے اور ان لوگوں کے درمیان
کوئی جنگ نہیں ہو رہی تھی ــ ہے
سوا تیروں اور پتھروں کے
پھینکنے کے۔

پھر اس کے بعد دوسرے صفحہ پر ہے :۔

فاقام رسول اللہ صلی اللہ

رسول خدا نے قیام فرمایا

---

[1] تاریخ ابن خلدون، جلد ۲ صـ۷۷ [2] تاریخ ابوالفداء جلد ۱ صـ۱۴۲
[3] تاریخ طبری، ط مصر ۱۹۳۹ء جلد ۲ صـ۵۷۲

علیہ وسلم وعدوهم محاصر وهم لم يكن بينهم قتال[1]

اور دشمن ان سب کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں اس کے سوا ان کے درمیان کوئی جنگ نہ تھی۔

حافظ ذہبی نے اپنی کتاب "العبر فی خبر من غبر" میں لکھا ہے:۔

لم يكن فيها الا رمى بالنبل ومصابرة اكثر من عشرين يوما وخرج للمبارزة عمرو بن عبد ود[2]

اس معرکہ میں بس تیر اندازی ہوتی رہی اور قوت برداشت کا مقابلہ بیس دن سے زیادہ رہا اور اب جنگ کرنے کے لیے عمرو بن عبدود نکلا۔

تلاش کی جائے تو اور مورخین کے یہاں بھی یہ صراحت موجود ملے گی۔

اس جنگ میں لڑائی جو ہوئی ہے وہ بس ایک ہے اور اسی کو تمام مورخین نے درج کیا ہے اور وہ حضرت علیؑ کا کارنامہ ہے۔ اور اسی پر یہ جنگ ختم ہو گئی ہے۔ جس کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

عمرو بن عبدود کی مبارز طلبی اور حضرت علیؑ کا کارنامہ

جنگ بدر میں مشرکین قریش کے بڑے بڑے سرداروں کے خاتمہ اور احد میں ان کے علم داروں کے ستھراؤ کے بعد اب مشرکین مکہ کے پاس صرف ایک

---

[1] تاریخ طبری، ط مصر ۱۹۶۱ء ج ۲ ص ۵۷۲ [2] العبر، ط کویت ج ۱ ص ۸

سورما باقی تھا جس سے امید وابستہ کی جا سکتی تھی۔ وہ عمرو ابن عبد ود بن ابی قیس تھا، عامر بن لوئی ابن غالب کی نسل سے جو قریش میں سے بنی عامر کہلاتی تھی اور اس لیے اس کے نام کے ساتھ عامری کا لفظ آتا ہے۔ وہ بدر کے معرکہ میں موجود تھا مگر اس دن جنگ میں بہت زخمی ہو گیا تھا تو پھر احد میں شریک نہیں ہوا۔ اب خندق میں وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوا اور اس نے اپنے سر پر ایک نشان لگا رکھا تھا جس سے اس کا امتیاز نمایاں رہے[۱]

راتوں کو تیر اندازی کے جو معرکے ہوتے تھے، ان میں بھی اس کا نام آیا ہے کہ اکثر وہ خندق کے پاس آ کر اپنے حوصلۂ نبرد آزمائی کا مظاہرہ کرتا تھا اور خندق کے بیچ میں حائل ہونے کے باوجود جب وہ خندق کے پاس آ جاتا تھا تو مسلمانوں میں تلاطم پڑ جاتا تھا کہ عمرو بن عبد ود آ گیا ہے اور اکثر رسول خداؐ کو سوتے سے جگا دیا جاتا تھا اور آپ کو مسلمانوں کی ڈھارس کے لیے بلا وجہ اس غیر تاریخی خندق کے پاس تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمانا پڑتی تھی[۲]۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک خطرہ مسلمانوں کے دل میں برابر یہ قائم تھا کہ کہیں عمرو بن عبد ود خیرہ خندق کو پار کر کے ادھر

---

[۱] طبری، طبع مصر ۱۹۶۹ء ج ۲ ص ۲۷۶ [۲] المغازی للواقدی

نہ آجائیں۔ ورنہ وہ لوگ خندق کے پار سے تیر اندازی کرتے رہتے۔ اور ان میں سے کچھ لوگ تیر برسا دیا کرتے۔ یہ راتوں کو پریشانی کے ساتھ مضطرب ہونے کی کیا وجہ تھی؟

اس کے علاوہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عمرو ان راتوں میں برابر اس طولانی خندق میں ایسے مقام کی تلاش میں لگا ہوا تھا جس کا پار کرنا کسی شہسوار کے لیے ممکن ہو اور آخر اس نے ایک جگہ تجویز کر لی اور پھر اس رات کو جس کی صبح ہونے پر اس نے یہ فیصلہ کن اقدام کیا جس کا ذکر ابھی آئے گا، اس نے کئی چوٹی کے پہلوانوں سے اس کا ذکر کر کے انھیں اپنے ساتھ متفق کیا۔

اس سے یقیناً اس کی بہادری کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ کہ اس طولانی محاصرہ کی دور دور سے بے نتیجہ تیر اندازی نے اس کے جذبات میں گھٹن کا سا احساس پیدا کر دیا تھا اور اب وہ بے چین تھا کہ کسی طرح سے مختتم مقابلہ ہو جائے۔ اور اب آج کا دن اس نے طے کر لیا تھا اور ان پہلوانوں کو اس نے اپنے منصوبہ سے آگاہ کر کے اپنے ساتھ تیار کر لیا تھا۔

عمرو کے علاوہ ان پہلوانوں کے نام تاریخ میں حسب ذیل ملتے ہیں:۔

(۱) عکرمہ بن ابی جہل مخزومی۔

(۲) ضرار بن خطاب قبیلۂ بنی محارب میں سے۔

(۳) ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی۔

(۴) نوفل بن عبداللہ۔ (۵) مرداس۔

بعض تاریخوں میں مرداس کا نام الگ نہیں ہے بلکہ ضرار کا نسب اس طرح لکھا ہے کہ "ضرار بن خطاب بن مرداس۔

ان سب نے آج یہ طے کر لیا تھا کہ آج ہمیں اس جنگ کا وارانیارا کرنا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اسلحۂ جنگ سے آراستہ ہو کر گھوڑوں پر سوار نکلے تو قبیلۂ کنانہ کی صفوں کی جانب سے گزرے اور کہنے لگے "اے کنانہ کے بہادرو! تیار ہو جاؤ۔ آج تمھیں معلوم ہو گا کہ شہسوار کون ہوتے ہیں"۔ چنانچہ ان فوجیوں کا دل بھی تیار ہو گیا اور ان کے پیچھے روانہ ہوا اور وہ چند دلبر اپنے گھوڑوں پر سوار آ کر خندق پر منڈلانے لگے غالباً اُس جگہ کی تلاش میں جہاں انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ چوڑان کم ہے اور گھوڑوں کو پھندا کر اُس پار پہونچ جانا ممکن ہے مگر زیادہ حصہ خندق کا اتنا وسیع تھا کہ اُس کا پار کرنا غیر ممکن معلوم ہو رہا تھا اور اس وجہ سے انھیں جناب سلمانؓ پر غصہ آ رہا تھا کہ یہ اُنھی کی بتائی ہوئی ترکیب ہے چنانچہ اس موقع پر اُن کی زبان پر یہ جملہ تھا۔

یہ اس طرح کی تدبیر ہے جسے عرب	ھٰذہ مکیدۃ ما کانت

ف۱ طبری، طامصر ۱۹۶۱ء ج ۲ صہ ۲۴۲

تعرضتھا۔ راہ | نہیں جانتے تھے

پھرتے پھرتے وہ جگہ انھیں مل گئی جہاں خندق کا عرض کچھ کم تھا اور ایک مرتبہ انھوں نے اپنے گھوڑوں کو چابک مارے تو عربی گھوڑے جست کر کے خندق کے اس پار پہونچ گئے۔

ظاہری حیثیت سے دیکھا جائے تو بہادری کے جوش میں انھوں نے یہ انتہائی حماقت کا کام کیا تھا اس لیے کہ اس طرح وہ گنتی کے آدمی اپنی پوری فوج سے کٹ کر الگ ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہاں کوئی تختے تو ایسے موجود نہ تھے جنھیں وہ خندق پر پل کی طرح رکھ کر اپنی پوری فوج کو اس پر سے گزار سکیں۔ اس طرح وہ اب بس چار پانچ آدمی ہی تھے اور ادھر مسلمانوں کا پورا لشکر تھا۔ اگر یہ سب بہتے ہی دوڑ پڑتے تو دو چار سپاہیوں کو بس ان کے لیے ان کی یورش ہی کافی ہو سکتی تھی مگر کیا کیا جائے کہ اس پوری فوج پر اس ایک عمرو بن عبدود کی ہیبت بری طرح چھائی ہوئی تھی جس میں اس کی اس حیرت انگیز غیر معمولی جرأت کہ اس نے خندق کو پار کرنے کی ہمت کس طرح کی اس وقت خاص طور پر اضافہ کر دیا تھا۔ اس لیے پوری مسلم فوج ہکا بکا ہو کر بس دیکھ رہی تھی جیسے سُن ہو گئی ہے۔ اُس وقت کا اُن کا عالم جو تھا اُس کی مُرقع کشی کے لیے تاریخ کے یہ الفاظ کافی ہیں:۔

سلہ طبری ج ۳ صفحہ ۲۴۳ | سلہ اعلام الوری

والاصحاب ساکنون کانما علیٰ رؤسھم الطیر [1] | تمام اصحاب بے حس و حرکت تھے جیسے اُن کے سروں پر طائر بیٹھے ہوئے ہوں۔

یعنی جیسے وہ ذرا بھی سر کو جنبش نہیں دینا چاہتے تھے کہ کہیں یہ طائر پرواز نہ کر جائیں۔

عمرو بن عبدود کتنا ہی بہادر سہی مگر اس وقت اُس نے اپنی تمام عمر کا سب سے بڑا جوا کھیلا تھا جس میں اپنی زندگی اور زندگی بھر کی شہرت داؤں پر لگا دی تھی۔ اُسے فطری طور پر یہ اندیشہ ہونا چاہیے تھا کہ ہم دو چار آدمیوں پر چاروں طرف سے مسلمانوں کی یلغار ہو گئی تو کیا ہوگا مگر اب جو اُس نے یہ سکون و سکوت کا عالم دیکھا تو اُس کی ہمت بڑھی اور اُس نے للکار کر اپنے مقابلہ کی دعوت دی۔

پیغمبر خدا کے پاس حضرت علیؑ موجود تھے۔ انھوں نے جو آواز سنی تو فوراً کہا۔

انا لہ یا رسول اللہ | میں یا رسول اللہ اس سے مقابلہ کروں گا۔

پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے مسلمانوں کو موقع بھی دینا چاہتے تھے اور پھر آپ کو معلوم تھا کہ عمرو بن عبدود کی نسبت "جہاں دیدہ" اور "تجربہ کار" اصحاب کے کیا تاثرات ہیں اور کیسے کیسے مشاہدات دہرائے جا رہے ہیں جس سے

---

[1] تاریخ خمیس ج ۱ ص ۴۸۶

تمام فوج اسلام کے لیے وہ ایک بہت بڑا "ہوا" بن گیا ہے۔ ہو سکتا تھا کسی کو یہ تصور ہوتا کہ علی چونکہ کمسن ہیں۔ یہ عمرو بن عبدِ ود کی شخصیت سے واقف نہیں ہیں اور انھوں نے نوجوانی کے الھڑپن میں جیسے بے سمجھے یہ بات کہہ دی۔ ان تمام حالی تصورات اور امکانی خیالات کے پیش نظر پیغمبر خدا نے بڑے معنی خیز انداز میں فرمایا:-

اجلس انہ عمرو۔	بیٹھو! (جانتے بھی ہو؟) وہ عمرو ہے۔

اتنی دیر میں عمرو کی ہمت اور بڑھ چکی تھی۔ اب اُس نے مسلمانوں کے ایمان باالآخرۃ اور عقیدۂ بہشت و دوزخ پر طنز شروع کر دیا۔ اُس نے کہا:-

این جنتکم التی تزعمون انہ من قتل منکم دخلھا افلا تبرزون الی رجلا؟	کہاں ہے وہ تمھارا بہشت جس کے لیے تمھارا خیال ہے کہ جو تم میں سے قتل ہو وہ اُس میں داخل ہوگا تو پھر اس وقت میری طرف کسی کو بھیجتے کیوں نہیں؟

پھر علیؑ بے قرار ہو کر اُٹھے اور رسولؐ نے وہی جملہ کہا۔ تیسری مرتبہ جب عمرو نے پھر آواز دی اور علیؑ پھر اُٹھے اور پیغمبرؐ نے وہی جملہ کہا تو حضرت علیؑ بولے:-

وان کان عمرا۔	اے عمرو ہے تو ہوا کرے۔

اب جو مقصد رسولؐ کا اس توقف سے تھا وہ حاصل ہو چکا

تھا۔ اب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انھیں اجازت دی۔[1]

علم رسالت و امامت الگ چیز ہے۔ عام نظام اسباب کے ماتحت رسول اور امام ہر شے سے وہی اثر قبول کرتے تھے جو ظاہری اسباب کا تقاضا ہے۔ اس لیے کوئی موقع ایسا جو خطرناک ہو اُس سے خطرہ کا احساس ہونا کوئی غلط چیز نہیں مگر بلند مقاصد کی خاطر اُس خطرہ کو قبول کیا جاتا ہے ــــ اس کا نام ہوتا ہے "قربانی"۔

عمرو بن عبدود سے جب کہ عام طور پر ہر شخص خطرہ محسوس کر رہا تھا تو رسول کو خطرہ کا احساس نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس احساس کے باوجود وہ اپنے گود کے پالے کو بھیج رہے تھے تاکہ عزّت حق کی حفاظت ہو۔ چنانچہ اس وقت رسولؐ کے اہتمام اور بارگاہ الٰہی میں تضرع و التجا کی کیفیت بھی بالکل وہی تھی جو ایک ایسے خطرہ کے احساس کے وقت اللہ سے لو لگانے والے انتہائی مخلص بندہ کی ہونا چاہیے۔

تاریخ کے الفاظ یہ ہیں:ـ

لما اذن رسول اللہ ؐ لعلیؑ اعطاہ سیفہ ذاالفقار والبسہ درعہ	جب پیغمبر خدا نے علیؑ کو اجازت دی تو اپنی تلوار ذوالفقار انھیں عطا فرمائی اور اپنی خاص زرہ ان کے

[1] تاریخ خمیس، جلد ۱ صفحہ ۴۸۶

الحد بيد وعمه بعمامته
وقال اللهم اعنه عليه
وفي رواية انه رفع
عمامته الى السماء
وقال الهي اخذت عبيدة
مني يوم بدر وحمزة يوم
احد وهذا علي اخي و
ابن عمي فلا تذرني فردا
وانت خير الوارثين ۔ ؎

زیب تن کی اور اپنا عمامہ اُن کے
سر پر باندھا اور کہا پروردگارا
اُس کے خلاف اِس کی مدد فرما
اور ایک روایت میں ہے کہ حضرتؐ
نے اپنا عمامہ آسمان کی طرف بلند
کیا اور کہا اے خدا! تو نے عبیدہ کو
مجھ سے بدر کے دن لے لیا اور حمزہ کو
احد کے دن۔ اب یہ ایک علیؑ ہے جو
میرا بھائی اور میرے چچا کا فرزند
ہے تو اب تو مجھے اکیلا نہ چھوڑنا اگرچہ تو بہترین ذات ہے جو سب کے
بعد باقی رہنے والی ہے۔

رسولؐ کا اس آیت کو پڑھنا کہ لا تذرنی فردا وانت خیر
الوارثین ___ یہ بتلاتا ہے کہ پیغمبر جو انھیں مثل اپنی اولاد کے
سمجھتے تھے اور یہ بھی کہ آپ اپنا تنہا مددگار عالم امکان میں اب
اس ذات کو جانتے تھے۔

maablib.com

علامہ طبرسی رحمہ اللہ نے اس محل پر غیر معمولی اختصار سے
کام لے کر صرف اتنا لکھ دیا ہے کہ :-

فبرز اليه علي عليه السلام

حضرت علیؑ نے اُس کے مقابلہ میں

؎ روح غنیس ، جلد ۱ صفحہ ۴۴

فقتلہ۔[1] | نکل کر اسے قتل کر دیا۔

بعض اور مورخین نے بھی مجملاً اتنا ہی لکھ دیا ہے کہ :-

قتل علی بن ابی طالب عمرو بن عبدود۔[2] | علی بن ابی طالب نے عمرو بن عبدود کو قتل کر دیا۔

خرج للمبارزۃ عمرو بن عبدود فبارزہ علی رضی اللہ عنہ فقتلہ۔[3] | عمرو بن عبدود جنگ کے لیے نکلا تو حضرت علی نے اس سے مقابلہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔

مگر ظاہر ہے کہ اتنے بڑے مرد جنگی کا قتل ہو جانا اتنی سی مختصر بات نہ تھی ـــ لہذا دوسرے مورخین اہل سنت نے اسے کافی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے مگر بیانات ان کے کچھ الجھے ہوئے سے ہیں۔

بعض مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب آگے بڑھے تو کچھ اور مسلمان فوجی بھی آپ کے ساتھ ہو لیے آپ نے ان لوگوں کو اس تنگ راستے پر کھڑا کیا جہاں سے یہ لوگ آئے تھے اور عمرو بن عبدود اور اس کے ساتھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے ان کی طرف آئے[4]

---

[1] اعلام الوریٰ [2] تاریخ ابن خلدون، جلد ۲ صفحہ ۲۵۸

[3] العبر فی خبر من غبر للحافظ الذہبی طبع کویت جلد ۱ صفحہ ۷

[4] طبری طبع مصر ۱۹۶۱ء ج ۲ صفحہ ۵۶۷ پہلا ایڈیشن مطبوعہ مطبع حسینیہ مصر ج ۳ صفحہ ۴۴

حضرت علیؑ بڑھ کر عمرو کے سامنے گئے۔ اُس نے پوچھا تم کون ہو؟ فرمایا علیؑ۔ اُس نے کہا عبد مناف کی نسل سے؟ کہا ہاں میں علی بن ابی طالب ہوں۔ وہ کہنے لگا اے میرے بھتیجے! تمھارے چچاؤں میں سے کوئی جو تم سے زیادہ سن دار ہو میرے مقابلہ کو آئے۔ مجھے تمھارا خون بہانے سے ناگواری محسوس ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا مگر مجھے بخدا تیرے خون کے بہانے سے کوئی ناگواری محسوس نہیں ہوتی۔ بس یہ سن کر اُسے طیش آگیا اور اُس نے اپنی تلوار کھینچ لی جو آگ کا شعلہ معلوم ہوتی تھی[۱] اور غصہ میں اپنے گھوڑے کے پیروں پر ماری تو چاروں پیر اُس کے کٹ گئے اور پھر آپ کی جانب بڑھا[۲]

طبری کی روایت ہے کہ آپ نے اُس سے کہا کہ تم نے تو اللہ سے عہد کیا ہے کہ قریش کا جو آدمی تمھارے سامنے کوئی دو خواہشیں پیش کرے گا تو تم اُن میں سے ایک تو ضرور منظور کرو گے۔ اُس نے کہا بے شک، حضرت علیؑ نے کہا اچھا تو پہلے میں تمھیں اللہ اور اُس کے رسول اور اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اُس نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے کوئی اور بات کہو۔ آپ نے کہا بس پھر دوسری بات یہ ہے کہ میدان میں اُتر پڑو۔ مقابلہ ہو جائے اُس پر اُس نے کہا کہ مجھے تمھارا قتل کرنا ناگوار ہے اور حضرت

---

[۱] تاریخ خمیس ج ا ص ۴۸۷ [۲] ابن الوردی ج ا ص ۱۲۲ ابو الفداء ج ا ص ۱۸۱

علیؑ نے کہا مجھے تو تمہارا قتل کرنا گوارا نہیں ہے۔ یہ سن کر عمرو کو تاؤ آگیا اور وہ بے تحاشا گھوڑے پر سے پھاند پڑا اور تلوار سے اُس کے پیر قطع کر دیے یا وہ تلوار اُس کے مُنھ پر لگا دی اور حضرت علیؑ کے سامنے آگیا۔[۱]

دیار بکری کی درج کردہ روایت میں ہے کہ جو دو باتیں آپ نے پیش کی تھیں اُن میں سے پہلی تو وہی تھی کہ اللہ اور اُس کے رسول اور اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور جب اُس نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں تو آپ نے فرمایا کہ اچھا دوسری بات یہ ہے کہ واپس چلے جاؤ اور اپنے گھر میں جاکر بیٹھو۔ اُس نے کہا یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ عرب کی عورتیں طعنہ نہ دیں گی کہ میں میدان میں آیا اور پھر بھاگ کر واپس گیا۔ آپ نے کہا تو پھر اب یہی رہ جاتا ہے کہ بڑھو، جنگ ہو جائے۔ اس پر اُس نے کہا مجھے تمہارا قتل کرنا پسند نہیں ہے۔ آپ نے کہا اب مجھے تو تمہارا قتل کرنا بالکل پسند ہے۔ یہ سن کر اس میں گرمی پیدا ہو گئی، وہ اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور تلوار کھینچ کر اس کے پیر قطع کیے اور دوسری ضرب اُس کے مُنھ پر لگائی۔ پھر حضرت علیؑ کی طرف آیا۔[۲]

دوسری جنگوں کا حال دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت

---

[۱] طبری طبع مصر ۱۹۶۹ء ج ۲ ص ۵۶۷، طبع اول ج ۳ ص ۴۸ [۲] تاریخ خمیس ج ۱ ص ۴۸۶

علی بن ابی طالبؑ کے مقابلہ میں عرب کا کوئی سورما کبھی دیر تک نہیں ٹک سکا بلکہ ادھر جنگ شروع ہوئی اور بس پہلے ہی وار میں اُس کا فیصلہ ہوگیا چنانچہ آپ کی یہ خصوصیت مشہور ہے کہ

کانت ضرباته ابکارا	آپ کی ضربیں یکتا ہوتی تھیں جب سر پر
اذا اعتلی قد و اذا	تلوار لگاتے تو لمبائی میں کاٹ دیتے تھے
اعترض قط	اور جب پہلو پر لگاتے تھے تو چوڑان

میں دو ٹکڑے کر دیتے تھے۔

مگر عمرو بن عبدود ایک وہ جنگ آزما ہے جو حضرت علیؑ کے مقابلہ میں دیر تک ٹھہرا رہا اور بہت سے واروں کے ادھر اُدھر سے تبادلہ کی صورت پیدا ہوئی۔

جنگ کے پورے کیفیات تاریخ میں درج نہ ہونے کے باوجود درج ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ غبار کی شدت سے کوئی ان دونوں مردانِ جنگ کی نقل و حرکت دیکھ ہی نہ رہا تھا پھر بھی تاریخ نے بالاجمال بھی جو جنگ کا حال لکھا ہے وہ مذکورہ بالا حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے مختصر الفاظ یہ ہیں:۔

فتنازلا وتجاولا فقتله	دونوں بہادر میدان میں اُترے اور جولانی
علیّ علیه السلام[1]	کرتے رہے جس کے نتیجہ میں حضرت علیؑ نے اسے

[1] تاریخ طبری پہلا ایڈیشن مطبوعہ مطبع حسینیہ مصر ج۳ ص۴۸ جدید ترین ایڈیشن ۱۹۶۱ء ج۲ ص۵۷۴

اس سے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک دم قتل نہیں ہوگیا بلکہ کچھ دیر ردّ و بدل ہوتی رہی اور مقابلہ جاری رہا ۔

اس سے زیادہ الفاظ یہ ہیں :۔

فتقاتلا و تجاولا وعلاهما غبرة وسمع المسلمون التكبير فعلموا ان عليًا قتله وانكشفت الغبرة واذا علیّ علیٰ صدره[۱] يذبحه ۔

دونوں نے باہم جنگ کی اور جولانی کرتے رہے اور ان دونوں پر غبار چھا گیا اور مسلمانوں نے تکبیر کی آواز سنی تو سمجھے کہ حضرت علی نے اُسے قتل کر دیا اور غبار ہٹا تو یہ نظر آیا کہ حضرت علی اُس کے سینہ پر سوار اُس کا سر تن سے اُتار رہے ہیں ۔

شیخ حسین بن محمد بن حسن، دیار بکری رقم طراز ہیں :۔

ثم اقبل نحوه فاستقبله علیّ رضی الله عنه بدرقته فضربه عمرو فيها فقدّها واثبت فيها السيف واصاب رأسه فشجه وضربه علیّ علیٰ حبل العاتق فسقط و ثار العجاج وسمع رسول الله التكبير فعرف ان عليا قتله[۲]

سابق گفتگو ختم ہونے کے بعد اُس نے آپ کی جانب رُخ کیا تو حضرت علی سپر لیے ہوئے اُسکے مقابلہ پر آئے مگر عمرو نے تلوار جو لگائی وہ سپر کو کاٹتی ہوئی آپ کے سر تک پہونچ گئی اور زخمی کر دیا اور اب حضرت علی نے اُس پر وار کیا تو تلوار اُسکے کندھے پر پڑی جس سے وہ گر گیا اور غبار بلند ہوا اور رسولخدا نے تکبیر سُنی تو سمجھے کہ حضرت علی نے اُسکو قتل کر دیا۔

---

[۱] ابن الوردی ج ۱ ص ۱۳۲ ابو الفداء ج ۱ ص ۱۳۲ [۲] تاریخ خمیس ج ص ۴۸۷

بہرحال ان کے بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ انہی دو ضربوں کی بس ردّوبدل ہوئی ورنہ غبار جنگ کے اتنے بلند ہونے کے کوئی معنی نہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ اُنھوں نے جنگ کی کیفیت اور طولانی ردّوبدل میں سے ان دو ضربوں کا تذکرہ کیا جن کا اثر بعد میں سامنے آ گیا۔ یعنی حضرت علیؑ کا زخمی ہونا اور دوسرے حریف کا قتل ہو جانا بے شک دوسرے مورخین سے تعجب ہے کہ اُنھوں نے اس اہم واقعہ کو کہ آپ زخمی ہوگئے کیوں نظر انداز کر دیا جب کہ وہ یقینی طور پر ثابت ہے اور اُس ردّوبدل کی شدت کا جسے دوسرے مؤرخوں نے لکھا تھا۔ انھوں نے کیوں ذکر نہیں کیا جب کہ صورت حال کی بنا پر وہ بھی یقیناً درست ہے۔

عمرو کے دوسرے ساتھی

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ عمرو کے ساتھ دوسرے منچلے بھی اُدھر کے، خندق کے پار آگئے تھے جن میں تاریخ نے چند ناموں کو محفوظ کیا ہے۔ عکرمہ بن ابی جہل، ہبیرہ بن وہب اور ضرار بن خطاب وغیرہ مگر حقیقت میں یہ کوئی مستقل وجود نہ رکھتے تھے۔ یہ صرف عمرو کے سہارے پر آئے تھے۔ اب عمرو کو جو اُنھوں نے خاک وخوں میں غلطاں دیکھا تو انھوں نے راہ فرار اختیار کی اور اُسی تنگ راستے سے جہاں سے پھاند کر وہ ادھر آئے تھے گھوڑے پھندا کر پھر

ادھر پہونچ گئے۔[۱]

معلوم ہوتا ہے کہ جو مسلمان وہاں کھڑے تھے وہ ان بھاگتے ہوؤں کے روکنے پر بھی قادر نہ تھے اور بھاگتے ہوئے کا پیچھا کرنا حضرت علی بن ابی طالبؑ کا شعار نہ تھا اس لئے آپ نے بھی ان سے کوئی تعرض نہیں فرمایا۔

طبری کا بیان ہے کہ عمرو کے ساتھ کے دو آدمی قتل ہوئے۔ ایک منبّہ بن عثمان بن عبید بن سباق بن عبد الدار، اُسے ایک تیر لگا جس سے وہ زخمی ہو گیا اور مکہ جا کر اُس زخم سے ہلاک ہوا۔ اور دوسرے بنی مخزوم میں سے نوفل بن عبد اللہ بن مغیرہ وہ خندق میں کود پڑا تو چوٹ کھا گیا۔ اِدھر سے مسلمان اُس پر پتھر برسانے لگے تو وہ پکارا "اے عرب قوم کے سپوتو! قتل ہی کرنا ہے تو اس سے اچھا کوئی طریقہ"۔ یہ سن کر حضرت علیؑ خندق میں اُتر گئے اور اُسے تلوار سے قتل کیا۔ مسلمانوں نے اُس کی نعش پر قبضہ کر لیا۔ مشرکین نے بعد میں خواہش کی کہ آپ کچھ رقم لے کر لاش ہمارے حوالے کر دیجئے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا ہمیں نہ اُس کی لاش کی ضرورت ہے اور نہ اُس کی قیمت کی چنانچہ آپ نے وہ لاش اُن کے سپرد کر دی۔[۲]

علامہ دیار بکری نے ایک روایت یہ درج کی ہے کہ عمرو بن عبدود

---

[۱] ابن خلدون ج ۲ ص ۷۵

[۲] طبری قدیم ایڈیشن ج ۳ ص ۴۹ تازہ ایڈیشن ج ۲ ص ۵۷۴

کے قتل ہونے کے بعد ضرار بن خطاب اور ہبیرہ بن وہب نے مل کر حضرت علیؑ پر حملہ کر دیا۔ آپ اُن دونوں کی جانب متوجہ ہوئے تو ضرار نے غور سے آپ کے چہرے کو دیکھا اور ایک دم فرار کیا۔ بعد میں سبب پوچھا گیا تو اُس نے کہا علی کی صورت دیکھتے ہی یہ محسوس ہوا کہ موت کی شکل مجھے نظر آ رہی ہے۔ دوسرا اُس کا ساتھی ہبیرہ ٹکا رہا تا کہ تلوار اُس کے جسم تک پہونچی۔ اب اپنی زرہ اُتار کر اُس نے پھینک دی اور خود بھاگ نکلا۔ حضرت علیؑ نے اپنے اصول کے مطابق کسی فرار کرنے والے کا پیچھا نہیں کیا۔

مگر یہاں پر مؤرخ نے کسی راوی کا بیان کردہ ایک عجیب منظر نقل کیا ہے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں :۔

قد کان ضرار بن الخطاب یفرّ و عمر یشتدّ فی اثرہ فکرّ ضرار راجعاً و حمل علی عمر بالرمح لیطعنہ ثم امسک و قال یا عمر ھذہ نعمۃ مشکورۃ اثبتّھا علیک و ید لی عندک غیر مجزی بھا فاحفظھا۔

ضرار بن خطاب جب بھاگ جا رہا تھا تو حضرت عمر نے اُس کا پیچھا کیا (پہلے تو ضرار اور شدت سے بھاگ رہا ہوگا مگر پھر اُسے یہ یاد آیا ہوگا کہ علی عام طور پر بھاگنے والے کا پیچھا نہیں کرتے، یہ ہو نہ ہو کوئی اور ہے جس پر یہ سوچتے ہی) ضرار پلٹ پڑا اور عمر پر نیزہ کے ساتھ حملہ کیا۔ پھر ہاتھ روک لیا اور کہا اے عمر یہ احسان اس وقت تمہارے ساتھ کر رہا ہوں شکرگزار رہنا اور یہ ایسا احسان ہے جس کا معاوضہ کچھ نہیں ہو سکتا، بس اسے یاد رکھنا۔

۱؎ تاریخ خمیس ج ۲ ص ۴۸۷

بلند ظرفی کا مثالی نمونہ

عرب میں عموماً جب کوئی اپنے مدمقابل پر جنگ میں غالب آکر اُسے قتل کرتا تھا تو اُس کی زرہ اور کپڑوں کو لاش پر سے اُتار لیتا تھا قانون اسلام میں بھی مجاہدین کے لئے اس دستور عرب کو برقرار رکھ کے اُسے اُن کا ایک آئینی حق قرار دیا گیا جس کے لئے یہ حدیث مشہور ہے کہ :-

من قتل قتیلا فلہ سلبہ	جو کسی کو قتل کرے تو اُس کے جسم کا لباس وغیرہ اُس کا حق ہوگا۔

مگر خود رسولؐ اور آلِ رسولؑ اپنے عمل میں قانون کی اکثر مراعاتوں سے فائدہ نہیں اُٹھاتے تھے اور یہی اُن کا بلند کردار وہ تھا جس نے تبلیغ اسلام میں شمشیر فولادی سے زیادہ کام کیا ہے۔ چنانچہ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے عمرو بن عبدود کو جب قتل کیا تو آپ نے اُس حق سے فائدہ نہیں اُٹھایا حالانکہ اُس کے جسم پر بڑی قیمتی زرہ تھی مگر آپ نے زرہ کو اُس کے جسم سے نہیں اُتارا کہ اُس کی لاش عریاں نہ ہوجائے۔

یہ وہ بلند ظرفی تھی جس کی قدر عمرو کی بہن کو ہوئی، جب وہ بھائی کی لاش پر آئی اور اُس نے دیکھا کہ جسم پر اُس کے زرہ اور لباس موجود ہے تو اُس نے کہا :-

maablib.com

ما قتله الا کفو کریم	اُسے قتل نہیں کیا ہے مگر کسی شریف برابر دار نے

پھر اُس نے قاتل کا نام دریافت کیا اور لوگوں نے بتایا کہ علی بن ابی طالب نے اسے قتل کیا ہے تو اُس نے یہ شعر نظم کئے :۔

لو کان قاتل عمرو غیر قاتله	لکنت ابکی علیه آخر الابد
لکن قاتله من لا یعاب به	من کان یدعی قدیما بیضة البلد[1]

"اگر عمرو کا اس قاتل کے سوا کوئی قاتل ہوتا تو میں اُس پر ہمیشہ ہمیشہ روتی رہتی مگر قاتل اس کا وہ ہے جس کے ہاتھ سے قتل ہو جانا کوئی عیب نہیں ہے۔ وہ وہ ہے جو ہمیشہ سے شہر کا ممتاز آدمی سمجھا جاتا رہا ہے۔"

زیادہ تر کتابوں میں یہ اشعار عمرو کی بہن ہی کے بیان کئے گئے ہیں مگر علامہ ابن صباغ مالکی نے تین مزید اشعار کے ساتھ درج کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

قالت امّ عمرو ترثیه	عمرو کی ماں نے اُسکے مرثیہ میں یہ شعر کہے

اس کے علاوہ مذکورہ بالا دونوں شعروں کا چوتھا مصرع انھوں نے یوں لکھا ہے :۔

من کان یدعی ابوه بیضة البلد[2]	وہ وہ ہے جس کا باپ اس شہر کا ممتاز ترین شخص کہا جاتا تھا۔

---

[1] تاریخ خمیس دیار بکری ج ۱ ص ۴۸۸ [2] الفصول المہمہ، ط ایران ص ۱۵-۵۱

مجھے معنوی حیثیت سے مصرع یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، لیکن مصرع کی اس تبدیلی کے بعد بھی اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ہم زیادہ تر مورخین کے تصریحات کے مطابق اُن کی نسبت عمرو کی بہن ہی کی طرف مرجح نہ سمجھیں۔

جنابِ سعدؓ بن معاذ معرضِ شہادت میں

مدینہ منورہ کے انصار میں بڑے ممتاز درجہ کے اور بہت معزز ایک صحابی جناب سعد بن معاذ تھے جنھوں نے شروع شروع رسولؐ کی ہجرت سے پہلے ہی ایمان قبول کیا تھا اور مدینہ کے اندر اشاعت اسلام میں ان کا بڑا حصہ تھا۔

یہ قبیلۂ اوس کے سردار تھے اور اوس کا قبیلہ بنی قریظہ کے ساتھ حلیف کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس بنا پر خود ان کے سرداران بنی قریظہ سے بڑے خاص قدیمی روابط تھے۔ اسی لئے پیغمبر خداؐ نے بنی قریظہ کی بغاوت کا حال سُن کر تحقیق حال کے لئے جن افراد کو بھیجا تھا اُن میں سعد بن معاذ بھی تھے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے وہاں جاکر اُنھوں نے اُن کو سمجھانے کی بھی کوشش کی جو کارگر نہ ہوئی بلکہ خود اُنھیں وہاں گالیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بنی قریظہ کے اس رویّہ سے جو اُنھوں نے اس جنگ کے موقع پر اختیار کیا تھا جناب سعد کو بڑی تکلیف پہونچی اور ان کی دلی تمنّا تھی کہ اس جنگ

سے فرصت ہو تو ان غداروں کو اُن کے کرتوت کی سزا دی جائے۔

غالباً اس وقت جب حضرت علیؑ اور عمرو بن عبدود میں مقابلہ ہو رہا تھا اور پھر حضرت علی نے عمرو کو قتل کیا، سب ہی مسلمان اپنی اپنی جگہ سے حرکت کر کے اس منظر کو دیکھنے کے لئے سامنے آ گئے تھے جب تک مقابلہ جاری رہا مشرکین بھی خندق کے اُس پار سے خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے مگر جب حضرت علیؑ کی صدائے تکبیر بلند ہوئی اور عمرو کے ساتھی فرار کر کے اُدھر پہونچے تو اب مشرکین کی فوج نے اپنی خفت مٹانے کو یا جوشِ انتقام کے غصہ میں یا اس خوف سے کہ کہیں اب مسلمان اُسی راستے سے خندق کو پار کر کے اُدھر نہ پہونچ جائیں تیر باراں کر دیا اور اس وقت ایک کافر حبان بن قیس بن العرقہ نے تاک کر ایک تیر سعد بن معاذ کو لگایا جو اُن کی کہنی کے پاس اُس مشہور رگ پر پڑا جسے اکحل کہا جاتا ہے[۱] اور وہ ایسی رگ ہے کہ اُس سے خون جاری ہو جائے تو بند نہیں ہوتا اور تمام جسم کا خون نکل جاتا ہے۔ چنانچہ خون بہتا تھا کہ یقین ہو گیا کہ اب جانبری مشکل ہے۔ اُنھوں نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی کہ پروردگارا! اگر ابھی مشرکین قریش سے جنگ کا کوئی موقع باقی ہو تو مجھے اُن کے مقابلے کے لئے زندہ رکھو اور اگر

---

[۱] تاریخ طبری طبع جدید ج ۲ ص ۵۷۵

اب اُن سے جنگ کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے تو اُسے میرے لئے حصول شہادت کا ذریعہ بنائے مگر مجھے اُس وقت تک دنیا سے نہ اُٹھا جب تک بنی قریظہ کا انجام میں اپنی آنکھ سے دیکھ نہ لوں۔ یہ دعا اُن کی قبول ہوئی اور فوراً خون بند ہو گیا۔[۱]

اس وقت کا عالم یہ تھا کہ کوئی فرش موجود نہ تھا جس پر زخمی سعد بن معاذ کو لٹایا جا سکے تو رسولؐ نے اپنے بستر پر سعد کو لٹایا اور خود حضرت فرش خاک پر تشریف فرما ہوئے۔[۲]

جنگ کا اختتام

جیسا کہ ہم نے قبل میں لکھا ہے اس جنگ میں معرکہ بس ایک ہی ہوا ہے اور وہ حضرت علیؑ اور عمرو بن عبدود کا مقابلہ — اس کے بعد جنگ ختم ہو گئی —— اب یہ ختم کیونکر ہوئی؟ مسٹر کے۔اے حمید لکھتے ہیں :-

"جب محاصرین شہر میں داخل ہونے سے عاجز ہو گئے تو تنگ آکر خود بخود محاصرہ چھوڑ کر چلے گئے۔"[۳]

جب کہ دوسرے مورخین سب یہ لکھتے ہیں کہ انتہائی شدید

---

[۱] مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۲۲۳ [۲] اعلام الوریٰ

[۳] تاریخ مسلمانانِ عالم حصہ اول ص ۷۹

آندھی آئی جس نے مشرکین کو سراسیمہ و مضطرب کر دیا اور اس غیر معمولی آندھی کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی موجود ہے :۔

یاایھا الذین اٰمنوا اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جآء تکم جنود فارسلنا علیھم ریحا وجنودا لم تروھا و کان اللہ بما تعملون بصیرا ہ وکفی اللہ المومنین القتال وکان اللہ قویا عزیزا ہ	اے مسلمانو! اللہ کا فضل و کرم جو تم پر ہوا یاد رکھو جب کہ تمھارے مقابلہ میں بڑی فوجیں آگئیں تو ہم نے ایک بڑی سخت ہوا اور اُن فوجوں کو بھیجا جنھیں تم دیکھ نہیں رہے تھے اور جو کچھ تمھاری کارگزاری تھی اُسے اللہ خوب دیکھ رہا تھا۔ اور اللہ نے مسلمانوں کو جنگ کی زحمت سے بچایا اور اللہ قوت والا ہے، زبردست قدرت والا۔

پھر اس سب کو نظر انداز کرنے میں معقولیت ہی کیا ہو سکتی ہے علامہ طبری تحریر فرماتے ہیں کہ اندھیری رات تھی اور بڑی سخت سردی تھی۔ رسولؐ اُس ٹیلے پر کھڑے ہوئے جس پر اس کے بعد مسجد فتح کی تعمیر ہوئی، اور کہا کون ہے جو جا کر اُن کی خبر لائے اور میں اُس کے لئے بہشت کا ضامن ہوں؟ اس پر کوئی کھڑا نہیں ہوا۔ پھر حضرتؐ نے دوبارہ اور سہ بارہ فرمایا۔ آخر جناب حذیفہؓ کھڑے ہوگئے اور جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا جاؤ اُن کی گفتگو سنو اور اُن کے حالات کی اطلاع مجھے دو۔ پھر حضرت

نے ہاتھ اپنے بارگاہ الٰہی میں اُٹھائے اور حذیفہ کے لئے حفاظت کی دُعا فرمائی۔ اس کے بعد اُدھر حذیفہ روانہ ہوئے اور ادھر حضرتؐ نماز میں مصروف ہو گئے اور بعد نماز بڑے سوز و درد کے ساتھ خالق سے فتح و نصرت کی دعا مانگی۔ حذیفہ نے جاکر دیکھا کہ آگیں سرد پڑی ہیں اور ایک سخت آندھی جس میں سنگریزے ہیں پوری فوج کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے، جس سے تمام خیمے اُکھڑ گئے ہیں، چھولداریاں زمین پر آ گئی ہیں۔ اور عالم یہ ہے کہ وہ ڈھالیں منھ پر لئے ہوئے سنگریزوں سے بچاؤ کی کوشش کر رہے ہیں۔ حذیفہ کا بیان ہے کہ سنگریزوں کے اُن ڈھالوں سے ٹکرانے کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ ابوسفیان اپنی سواری کے قریب آیا اور پکارا النّجا النّجا یعنی "بھاگ کر اپنی جان بچاؤ، جان بچاؤ" یہی عینیہ بن حصین نے کہا اور یہی آواز حارث بن عوف نے بلند کی اور بس اس کے بعد جتنی فوجیں تھیں سب واپس ہو گئیں اور حذیفہ نے اس سب کی اطلاع آکر پیغمبر خداؐ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی۔[1]

بہر صورت اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجایش نہیں ہے کہ اصل پست ہمتی اور تھوڑدلی اُن میں عمرو بن عبدود کے قتل سے پیدا ہو چکی تھی اور اس کے بعد اُن میں پھوٹ بھی پڑ گئی تھی

---

[1] اعلام الوریٰ

جس کا تفصیلی بیان تاریخ میں موجود ہے۔[۱] اب وہ واپسی کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈھ رہے تھے، چنانچہ اس شدید آندھی کے حملہ نے انھیں واپس جانے کا ایک قوی سبب پیدا کر دیا جس کے بعد پھر کبھی ہمت اُن کو مدینہ پر حملہ کی نہیں ہوئی۔

بنی قریظہ کی سرکوبی

قریظہ یہودیوں کا ایک طاقتور قبیلہ تھا۔ اس جنگ خندق کے ایسے نازک حالات میں اپنے عہد و پیمان کو توڑ کر پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں کی پریشانی میں شدید اضافہ کیا۔ اس سے حضرت پیغمبر خداؐ اور تمام آپ کے وفاداروں کو اتنی تکلیف ہوئی کہ جیسا پہلے آ چکا ہے سعد بن معاذ نے تیر کا مہلک زخم کھانے کے بعد بارگاہ پروردگار میں جو التجا کی وہ یہ کہ بنی قریظہ کا آخری انجام میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں ۔۔۔ اب مشرکین کی شکست خوردہ واپسی اور پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں کی فتح مندانہ مراجعت کے بعد اس کا وقت آ گیا تھا۔ چنانچہ پیغمبر خداؐ نے جنگ خندق سے مدینہ آنے کے بعد برنبائے وحی الٰہی مسلمانوں کو ذرا دم لینے کا موقع بھی نہ دیا اور اُسی دن بنی قریظہ کے یعنی قریظہ کے قلعہ کی طرف کوچ کا حکم ہو گیا اور سب روانہ ہو گئے۔[۲]

---

[۱] طبری تازہ ایڈیشن ج ۲ ص ۵۷۸ - ۵۷۹

[۲] شذرات الذہب فی اخبار من ذہب لابن العماد الحنبلی ج ۱ ص ۱۱

مولوی عبدالباری ایم۔ اے نے چونکہ غزوۂ خندق کی تاریخ ۲۸ ذیقعدہ ۵ھ درج کی ہے لہٰذا بنو قریظہ کے ساتھ جنگ کو ذی الحجہ ۵ھ میں بتایا ہے[۱] لیکن مستند تاریخیں غزوۂ بنی قریظہ کو ذیقعد میں بتاتی ہیں[۲]۔

باتفاق مورخین علم لشکر حضرت علی بن ابی طالب کے سپرد کیا گیا[۳] اور تمام لوگوں کو تاکید فرمائی گئی کہ نماز عصر جاکر بنی قریظہ کے اندر پڑھنا۔ حضرت علیؑ مہاجرین اور بنی عبدالاشہل اور بنی نجار کی جماعتوں کو ساتھ لیے اُن کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ اُن کے قلعوں کے سامنے پہونچ گئے۔ انھوں نے قلعہ کے اوپر سے آپ کو دیکھا تو گالیاں دینے لگے اور نہ صرف آپ کی نسبت بلکہ پیغمبر خداؐ کی شان میں بھی طرح طرح کے رکیک الفاظ کہنے لگے اس جہالت کا جواب آپ نے مکمل خاموشی سے دیا۔ چونکہ رسولخداؐ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم باقی مسلمانوں کے حلقہ میں روانہ ہوئے تھے حضرت علی نے پلٹ کر راستے میں آپ کو ٹھہرایا اور عرض کیا کہ حضور! آپ اُن کے قریب تشریف نہ لے جائیں تو کیا حرج ہے، انشاء اللہ وہ خود رسوا ہو کر رہیں گے۔ پیغمبر سمجھ گئے

---

[۱] دعوت دہلی، سیرت طیبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ ص ۱۸۳

[۲] ابوالفداء ج ۱ ص ۱۳۳ اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۲۳۹

[۳] ابن الوردی ج ۱ ص ۱۳۲ طبری طبع جدید ج ۲ ص ۵۸۲ ابوالفداء ج ۱ ص ۱۳۲ مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۲۳۹

کہ وہ لوگ گالیوں پر اُتر آئے ہیں۔ علامہ طبرسی کا بیان ہے کہ آپ نے وہیں قیام فرمایا۔[1] مگر دوسرے مورخین کہتے ہیں کہ حضرت نے اُن کی بد زبانیوں کی پرواہ نہیں کی اور قلعہ کے سامنے تشریف لے گئے۔ اور مسلمانوں نے چاروں طرف سے اُن کے قلعوں کو گھیر لیا اور پچیس دن تک یہ محاصرہ قائم رہا۔

بنی نضیر کا سردار حُیی بن اخطب جس نے مشرکین کی فتح کے سبز باغ دکھا کر اُنھیں غداری پر آمادہ کیا تھا۔ اُن کے سرداروں سے اپنی گفتگو کے ذیل میں زبان دے چکا تھا کہ اگر میرے توقعات غلط ثابت ہوئے اور اہل مکہ مدینہ میں داخل نہ ہو سکے تو پھر میں تمھارے قلعہ میں آجاؤں گا کہ جو حال تمھارا ہو وہ میرا بھی ہو۔ اُس نے واقعی اپنے اس قول پر عمل کیا اور وہ مشرکین کے شکست کھانے کے بعد بجائے اپنے قبیلہ کی طرف جانے کے بنی قریظہ کے قلعہ میں آگیا اور اُن کے انجام میں شرکت کے لئے محاصرہ کے دوران اُن کے ساتھ بند رہا۔

پچیس دن کے محاصرہ کے بعد جب اُن کے لئے کوئی چارہ کار نہ رہا تو اُنھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟

یہ امر یقینی ہے کہ اس کے بعد جو اُن کا نتیجہ ہوا وہ جناب سعد بن معاذ کے فیصلہ کے مطابق ہوا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ فیصلہ

---

[1] اعلام الوریٰ۔

ان کے جرم کی شدت کے بالکل مطابق سخت ہوا جس کا تذکرہ ابھی
ہوئے گا۔ مگر سعد بن معاذ ثالث کیونکر مقرر ہوئے؟
اس کے لئے میں نے قدیم تاریخوں میں کافی جستجو کی تو وہ سب
صورت بتلاتی ہیں کہ مدینہ میں یہود کے جس قبیلہ نے پہلے غداری
کی تھی بنو قینقاع وہ انصار میں سے قبیلۂ خزرج کے حلیف تھے یعنی
ان سے معاہدۂ دوستی رکھتے تھے اور یہ بنی قریظہ دوسرے انصار
کے قبیلۂ اوس کے حلیف تھے۔ بنی قینقاع نے جب ہتھیار ڈالے
تو عبداللہ بن ابی نے جو قبیلۂ خزرج کا رکن رکین تھا رسولؐ سے
ان کے بارے میں نرمی برتنے کی سفارش کی اور حضرتؐ نے
ان کے ساتھ یہ مراعات برتی کہ اُنھیں حکم دیا کہ وہ صحیح سلامت
مدینے سے باہر چلے جائیں۔ اب بنی قریظہ نے جو مجبور ہو کر ہتھیار
ڈالے تو اوس کے قبیلے نے آکر حضرتؐ کو گھیر لیا اور کہا جس طرح
عبداللہ بن اُبی کے کہنے سے آپ نے بنی قینقاع کے ساتھ فیاضانہ
برتاؤ کیا اُسی طرح بنی قریظہ کے ساتھ بھی کیجئے۔ حضرتؐ نے فرمایا
کیا تم اس پر تیار ہو کہ ان کے معاملہ کو سعد بن معاذ پر چھوڑ دیا جائے
سعد بن معاذ خود اسی قبیلۂ اوس کے سردار تھے۔ وہ سب بڑی
خوشی سے اس پر راضی ہو گئے اور اُنھوں نے کہا 'جی ہاں، مناسب
ہے کہ سعد بن معاذ ان کے بارے میں فیصلہ کر دیں۔ اس طرح سعد
بن معاذ بُلائے گئے۔ اور اُنھوں نے وہ فیصلہ کیا جو ابھی آپ کے

سامنے آئے گا۔

ابن وردی کے الفاظ ذیل میں درج ہیں :-

حاصر بنی قریظة خمسا و عشرین لیلة و قذف الله فی قلوبهم الرعب فنزلوا علی حکمه صلی الله علیه وسلم وکانوا حلفاء الاوس فسألته الاوس فیهم کما اطلق بنی قینقاع حلفاء الخزرج بسؤال عبدالله بن ابی بن ابی سلول فقال الا ترضون ان یحکم فیهم سعد بن معاذ و هو سید الاوس قالوا بلی ظنا منهم انه یحکم باطلاقهم فامر باحضار سعد[1]

حضرتؐ نے بنی قریظہ کا پچیس ۲۵ رات تک محاصرہ قائم رکھا اور اللہ نے ان کے دلوں پر ہیبت طاری کر دی تو انھوں نے حضرتؐ کے فیصلہ پر انحصار کر کے ہتھیار ڈال دیئے اور وہ قبیلہ اوس کے حلیف تھے اوس نے اُن کے بارے میں حضرتؐ سے درخواست کی جیسا آپ نے بنی قینقاع کو جو خزرج کے حلیف تھے عبداللہ بن ابی سلول کی درخواست پر چھوڑ دیا تھا حضرتؐ نے فرمایا تم لوگ کیا اس پر تیار نہیں ہو کہ سعد بن معاذ انکے بارے میں فیصلہ کریں وہ قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ وہ سب کہنے لگے کیوں نہیں ہم بالکل اس پر تیار ہیں اور اُنکا خیال تھا کہ سعد اُنکے چھوڑ دینے کا فیصلہ کرینگے۔ اس پر حضرتؐ نے سعد کے بُلائے جانے کا حکم دیا۔

لہ تاریخ ابن الوردی ج ۱ ص ۱۲۲

جتنی قدیم تاریخیں ہیں سب صورت واقعہ اسی طرح لکھ رہی ہیں[1]
جیسا کہ بعد کو آئے گا جو فیصلہ سعد نے کیا وہ منطقی طور پر اور آئین
انصاف و قانون عدل اور اصول کے لحاظ سے بالکل درست تھا
مگر اس سب کے باوجود دل تاریخ کے اِن بیانات سے مطمئن نہیں ہوتا
اور کچھ اور تلاش کر رہا ہے۔ اس تلاش میں مجھے تو اریخ اہل سنت
میں بالکل کامیابی نہیں ہوئی مگر علامہ طبرسی رح کے بیان میں مجھے یہ دل
کا مطلب یا "گم گشتہ حقیقت" مل گئی اور جیسا کہ تاریخ اسلام حصۂ
اول میں میں نے اس پر متنبہ کیا ہے آل رسولؐ کے ارشادات سے علامہ
طبرسی کے یہاں کچھ ایسے "جواہر پارے" آگئے ہیں جن سے عام تاریخیں
خالی ہیں۔ یہاں اُنھوں نے اگرچہ کوئی سند درج نہیں کی ہے مگر جمہور
کی تاریخ سے الگ کسی جزء کا بیان ہونا خود اِس بات کا ثبوت ہے کہ
یہ کسی اور ماخذ سے دستیاب ہوا ہے۔ طبرسی رحمہ اللہ کے الفاظ جو بہت
مختصر ہیں مگر بڑے قیمتی ہیں۔ حسب ذیل ہیں :-

فحاصرھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ خمسا و عشرین لیلۃ حتی نزلوا علی حکم سعد بن معاذ[1]

پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پچیس دن تک اُن کا محاصرہ قائم رکھا یہاں تک کہ اُن لوگوں نے سعد بن معاذ کے فیصلہ پر انحصار کر کے ہتھیار ڈالدیے۔

---

[1] المغازی للواقدی ج ۲ صـ۵۰۹ طبری طبع جدید ج ۲ صـ۵۸۶ تاریخ ابن خلدون طبع بیروت ۱۹۵۶ء ج ۲ صـ۲۸ ابو الفداء ج ۱ صـ۱۳۳
اعلام الوریٰ صـ۵۲

دل بڑی گرمجوشی سے ان الفاظ کا استقبال کرتا ہے اور وہ بالکل قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں کیونکہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے سعد بن معاذ کے اُن سے اس کے پہلے بڑے گہرے روابط تھے وہ سمجھے کہ سعد اُن تعلقات کی بنا پر ہم سے رعایت کریں گے حالانکہ سعد بڑے مخلص باایمان تھے۔ وہ ایمانی تقاضوں کے سامنے ذاتی تعلقات کا خیال نہیں کر سکتے تھے۔ اور غالباً قبل میں انھیں بنی قریظہ کی وفاداری پر بھروسہ تھا۔ اس لئے جب خلاف اُمید اُن سے عہد شکنی اور غداری ظہور میں آئی تو اُنھیں شدید رنج پہونچا اور فطری طور پر بہت سخت غصہ تھا۔ جس کا ثبوت اُس واقعہ سے ملتا ہے جو پہلے درج ہو چکا ہے کہ جب جنگ خندق میں اُنھیں مہلک زخم تیر کا لگا تو اُنھوں نے ہاتھ اُٹھا کر خدا سے دُعا بھی کی کہ خداوندا مجھے دنیا سے اُٹھانا نہیں جب تک کہ ان کی بدعہدی کا انجام میں اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لوں۔ اب اسے قدرت خدا کے سوا کیا سمجھا جائے کہ اُنہی دشمنوں کی طرف سے خود اُنہی کے ہاتھوں ان کی اس دعا کی قبولیت کا سامان ہو رہا تھا۔

دل کہتا ہے کہ اگر وہ اپنے کو خدا اور رسولؐ کے رحم و کرم پر چھوڑتے تو اُنھیں اتنے تباہ کُن انجام کا شاید سامنا نہ کرنا پڑتا۔ مگر اُنھوں نے رسولؐ کریم کے خلقِ عظیم پر بے اعتمادی سے کام لیتے ہوئے اپنے ذاتی تعلقات پر بھروسا کیا اور سعد کو ثالث بنا دیا۔ جس کے بعد فیصلہ

کی ذمہ داری خود رسولؐ پر بالکل نہ رہی۔ انھیں سعد کے ذاتی تعلقات پر بھروسا تھا جو انھوں نے اُن کا نام ثالثی کے لئے پیش کیا اور رسولؐ کو اُن کے خلوص ایمانی پر اعتماد تھا جو آپ نے اُن کی اس پیشکش کو قبول فرمالیا۔ مگر اصولاً اگر علامہ طبرسی کا بیان مجھے سہارا دینے کے لئے نہ ہوتا تو صرف دل کے فتوے میں بطور واقعہ اس رُوئداد کو لکھنے کی جرأت نہ کرتا لیکن مؤرخین اہل سنّت باوجودیکہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامۂ طبرسی کی کتاب "اعلام الورے" اُن کے سامنے نہ تھی صرف دل کے تقاضے سے اس چودھویں صدی میں متفقہ طور پر صورت واقعہ اسی طرح درج کر رہے ہیں جن میں جہاں تک مجھے علم ہے سب سے سابق زمانۂ حال کے اُردو تاریخ نگاروں کے سرخیل مولانا شبلی ہیں جنھوں نے اس طرح لکھا ہے :-

"تقریباً ایک مہینہ محاصرہ رہا۔ بالآخر اُنھوں نے درخواست پیش کی کہ حضرت سعد بن معاذ جو فیصلہ کریں ہم کو منظور ہے۔ حضرت سعد بن معاذ اور اُن قبیلہ (اوس) قریظہ کا حلیف اور ہم عہد تھا۔ عرب میں یہ تعلق ہم نسبی سے بڑھ کر تھا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی درخواست منظور کرلی"۔[۱]

---

[۱] سیرۃ النبی حصہ اول مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ سنہ ۱۹۶۰ء صفحہ ۳۵۰

اب اس کے بعد تو جتنے اہل قلم ہیں سب یہی لکھ رہے ہیں۔ جس طرح قدیم مورخین میں مجھے تلاش سے علامہ طبرسی کے سوا کوئی ایسا نہیں ملا جس نے اسے لکھا ہو، اُسی طرح اس صدی کے ہندوستانی تاریخ نگاروں میں مجھے کوئی ایسا نہیں ملا جس نے اس کے خلاف لکھا ہو چنانچہ قاضی محمد سلیمان رقمطراز ہیں :-

"انھوں نے چاہا کہ ایک منصف جو مقبول فریقین ہو اُن کا فیصلہ کرے۔ منصف نے اُن کا فیصلہ بموجب احکام توریت شریف جس کے وہ قائل تھے کر دیا۔[۵۱]"

نعیم صدیقی لکھتے ہیں :-

"حضور نے اُن سے گفت و شنید کر کے اُن کی رضامندی سے سعد بن معاذ کو حکم ٹھہرایا اور دونوں طرف سے پورے اعتماد کے ساتھ فیصلہ اُن پر چھوڑ دیا گیا۔[۵۲]"

محمد اجمل خاں کے الفاظ یہ ہیں :-

"یہودیوں نے سعد بن معاذ کو حکم بنایا کہ وہ جو فیصلہ کریں گے ہمیں منظور ہوگا۔[۵۳]"

مولوی عبدالحلیم احراری بی اے آنرز جامعہ ملیہ (یعنی ڈاکٹر عبدالعلیم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) بھی یہی تحریر فرماتے ہیں کہ :-

---

۵۱ رحمتہ للعالمین ط لاہور ص ۲۳۸ ۵۲ محسن انسانیت مطبوعہ سرگودھا حصہ اول ص ۔۔۔

۵۳ رسول عربی مطبوعہ الجمعیتہ پریس دہلی ص ۳۹۹

"خود بنی قریظہ نے یہ درخواست کی تھی کہ سعد بن معاذ کو جو ان کے حلیف تھے ان کا فیصلہ کرنے کی اجازت دی جائے"[1]

مولوی اولاد حیدر صاحب فوق مرحوم نے معلوم نہیں کس ماخذ سے اسے زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ:۔

"ہر طرف سے مایوس و مجبور ہو کر آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے تصفیہ کے خواہاں ہوئے۔ آپ ان غداروں کی مفسد طبیعتوں سے خوب واقف ہو چکے تھے اور ان کی فتنہ انگیز حرکتوں کا متواتر تجربہ اٹھا چکے تھے۔ اس بنا پر خود تصفیہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ میں تصفیہ کرنے پر راضی تو ضرور ہوں لیکن میں خود تصفیہ نہیں کروں گا۔ تم ہی اپنی طرف سے کسی کو حکم کر دو جو وہ تصفیہ کر دے اُس پر ہم دونوں راضی ہو جائیں۔ بنی قریظہ نے قبول کر لیا اور اپنے قدیم تعلقات کی بنا پر سعد بن معاذ کو حکم مقرر کیا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی سعد کی تحکیم کو منظور فرما لیا۔"[2]

جناب سعد بن معاذ چونکہ مہلک طور پر تیر کا زخم کھا چکے تھے اور پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اُن کے ساتھ بہت تعلق خاطر تھا

---

[1] سیرت نبوی اور مستشرقین شائع کردہ مکتبہ جامعہ اسلامیہ دہلی ص۵۵

[2] اسوۃ الرسول ج ۲ ص۵۴۹

تو مدینہ میں آنے کے بعد حضرتؐ نے اُنھیں اُن کے مکان جو فاصلہ پر تھا جانے نہیں دیا تھا بلکہ فرمایا تھا کہ میں چاہتا ہوں یہ مجھ سے قریب رہیں کہ میں وقتاً فوقتاً انھیں آکر دیکھ سکوں۔ اس لئے وہ مسجد نبوی کے احاطہ میں ایک خیمہ کے اندر فروکش تھے۔

اَب اُن کے فیصلہ پر جو انحصار کیا گیا تو حضرتؐ کے حکم سے لوگ جا کر اُنھیں ایک مرکب پر سوار کر کے لائے حضرتؐ نے اُنھیں آتے دیکھا تو قبیلۂ اوس کے لوگوں سے فرمایا: قوموا الیٰ سیّدکم "اُٹھو اَپنے سردار کی طرف" یعنی جاؤ اور مرکب سے اُتار کر اُنھیں آرام کے ساتھ لاؤ[1]

حضرتؐ کا اشارہ پاتے ہی یہ لوگ دوڑ پڑے۔ جناب سعد بن معاذ نے مرکب سے اُترتے ہی پہلے اُن لوگوں سے کہا کہ جو کچھ میں فیصلہ کروں اُس پر تم سب لوگ راضی رہو گے۔ اُن لوگوں نے متفقہ طور پر اقرار کیا۔ اب ادب و احترام کی بنا پر بغیر حضرتؐ کو مخاطب کئے یا حضرتؐ کا نام لئے اُنھوں نے اُس سمت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اُدھر کے حضرات بھی اُسے قبول کریں گے؟

اس سے ظاہر ہے کہ حضرتؐ کے طبعی رحم و کرم کی بنا پر اُنھیں اندیشہ تھا کہ وہ سخت فیصلہ جو کریں گے حضرتؐ کے نزدیک سزاوارِ عمل نہیں ہو گا۔

---

[1] ابن خلدون ج ۲ ص ۲۲

"حضرت سعد نے جو فیصلہ کیا وہ توراۃ کے مطابق تھا۔

توراۃ کتاب تثنیہ اصحاح ۲۰ فقرہ ۱۰ میں ہے :۔

"جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لئے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے۔ اگر وہ صلح کر لیں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو اُن کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو اُن پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے۔ باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں، سب تیرے لئے مال غنیمت ہوں گی۔"[۵]

ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب لکھتے ہیں :۔

"دراصل بنو قینقاع اور بنو نضیر کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا وہ انصاف نہیں تھا بلکہ اس میں رحم کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ رسول خداؐ جیسا رحیم انسان اس کا ذمہ دار ہے۔ ہاں بنو قریظہ کے ساتھ پورا انصاف کیا گیا اور سختی کے ساتھ وہ سزا دی گئی جس کے وہ مستحق تھے اگر کسی کو اس میں بے جا شدت نظر آتی ہے تو اس کے ذمہ دار رسولؐ نہیں سعد بن معاذ ہیں جو بنو قریظہ کے

۵؎ سیرت النبی حصہ اول ص ۴۳۵-۴۳۶

دوست تھے اور جنھیں خود اُنھوں نے نامزد کیا
تھا۔"

لین پول لکھتا ہے:-

"سزا سخت تھی — لیکن یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ان لوگوں کا جرم حکومت سے کھلی ہوئی بغاوت تھی اور وہ بھی محاصرہ کے زمانہ میں۔ جو لوگ یہ پڑھ چکے ہیں کہ ولنگٹن کی فوج کے راستے کا پتہ غداروں اور ڈاکوؤں کی اُن لاشوں سے چلتا تھا جو اِدھر اُدھر درختوں پر لٹکتی ہوتی تھیں اُنھیں تو کم از کم ایک غدار قبیلہ کے قتل کئے جانے پر متعجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔[۱]"

حقیقت امر یہ ہے کہ سزا کے درجوں میں جرم کی ابتدائی اور انتہائی منزلوں کے اعتبار سے بھی فرق ہوتا ہے۔ یعنی کسی کی پہلی مرتبہ جرم کیا ہو تو اُس کے لئے ہلکی سزا تجویز کرنا مناسب ہوتا ہے لیکن وہی جرم جب دوبارہ سرزد ہو تو پہلی سزا ناکافی قرار پاتی ہے اور اب سزا اُس سے سخت تر ہوتی ہے اور جب پھر تیسری مرتبہ وہی جرم ہو تو اگر اُتنا ہی ہو جتنا پہلے ہوا تھا تو بھی سزا شدید تر ہو جائے گی چہ جائیکہ خود جرم اپنی کیفیت اور ماحول اور اثرات کے لحاظ سے شدید تر ہو گیا ہو تو اب یہ خیال کرنا کہ سزا بس وہی

---

[۱] سیرت نبوی اور مستشرقین ص۷۶

ہو جو پہلے دی گئی تھی اصول مکافات کے لحاظ سے بالکل غلط ہے۔

یہود کے قبائل میں جو مدینہ کے اندر تھے، بنی قینقاع کا جرم پہلی دفعہ ہوا تھا۔ انھیں جلاوطنی کی سزا دی گئی تھی اس سے دوسرے قبیلوں کو سبق لے لینا چاہیے تھا مگر دوسری مرتبہ بنو نضیر نے وہی عمل اختیار کیا اور اب بنی قریظہ نے اس غداری کے کردار کو تیسری مرتبہ اختیار کیا اور پھر ان نازک حالات میں جب ایک اتنے بڑے طاقتور غنیم کے حملہ آور ہونے سے قوم کی حیات وموت کا سوال درپیش تھا اور یہ بھی پریشانی کوئی کم نہ تھی کہ اس قبیلہ نے ایسے نازک حالات میں عہد شکنی کرکے اور مخالف طاقت کے ساتھ ہونے کا اعلان کرکے پریشانی میں بدرجہا اضافہ کر دیا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ایسی صورت میں ان کا معاملہ یقیناً پہلے دونوں قبیلوں سے بالکل مختلف ہو گیا تھا اور ان کے جرم کی سزا کو اصولاً سخت تر ہونا ہی چاہیے تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو لفظیں ہم نے پہلے استعمال کی ہیں یعنی ہمارے دل کا فیصلہ یہ ہے کہ خود پیغمبر خدا پر چھوڑ دیا گیا ہوتا تو آپ یہ سخت سلوک تجویز نہ فرماتے، یہ شاید بس دل ہی کا تقاضا ہے اور دل بھی وہ جو کسی بھی مجرم کی سخت سزا کو سن کر لرز جاتا ہے۔ لیکن اسلامی قانون میں سزا کا اصول ہمارے ان دلی تقاضوں کے کہیں بھی مطابق نہیں ہے

خود مسلمانوں کے جرائم جنھیں فروعی حیثیت حاصل ہے، اُن کی سزا کی سختی کو آج کے لوگوں کے دل کہاں قبول کرتے ہیں۔ مثلاً چور کے ہاتھ کاٹنا اور اس سے بڑھ کر زنائے محصنہ کے مرتکب مرد یا عورت کا سنگسار کیا جانا۔ ذرا اپنے دل کے سامنے اس منظر کا تصور پیش کیجئے کہ ایک انسانی جسم پر پتھر پڑ رہے ہیں۔ خون کے فوارے چاروں طرف بکھر رہے ہیں۔ وہ بار بار اس گڑھے کے اندر سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اور پتھروں کی بارش سے اُسے پھر اُس میں گرا دیا جاتا ہے۔ اس پر ہمارا آپ کا دل کیا محسوس کرے گا؟ دل کا لرزنا کیسا! ہم شائد اس منظر کو دیکھ کر غش کھا کے گر پڑیں مگر اصول کے لحاظ سے یہی سخت سزائیں وہ ہیں جو سزا کے اصل مفاد کو پورا کرتی ہیں اور اسے ہر شخص عالم مشاہدہ میں اس وقت بھی دیکھ سکتا ہے کہ ہمارے ان ملکوں میں جہاں کی سزاؤں کو چور تفریح طبع کے طور پر بار بار کاٹ کر نکلتے ہیں کتنی چوریاں ہوتی رہتی ہیں اور حجاز میں جہاں شریعتِ اسلام والی سزا کا اندیشہ ہے چوریوں کا کس طرح سدِّباب ہو گیا ہے۔

ہمارے ایسے ہی دل کے تقاضے کو جو مجرموں کے بارے میں ترحم کا جذبہ محسوس کرتا ہے، قرآن نے زناکار کی سزا سناتے ہوئے یہ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ لا تاخذکم بھما رافۃ فی دین اللہ "تمھیں

اطاعت الٰہی کے فرض کو انجام دینے میں اُن زناکار مرد اور عورت کے ساتھ کہیں جذبۂ ترحّم پیدا نہ ہو جائے“ ــــ لہٰذا جو حکمت ان سزاؤں کی سختی کو درست قرار دیتی ہے وہی حکومت اسلامیہ کے اُن بدترین باغیوں کی سزا کو صحیح قرار دیتی ہے اور اس لئے جناب سعد بن معاذ نے جو سزا تجویز کی اُسے بلاشبہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منظور ہی نہیں کیا بلکہ اُس فیصلہ کی تعریف فرمائی ــــ ایسی صورت میں اُصولاً وہ ہمارے دل کا تقاضا کوئی چیز نہیں ہے اور ہمیں اس فیصلہ کی ذمّہ داری سے حضرت رسولِ خدا کو بچانے کی کوشش بھی اصولاً درست نہیں ہے۔ جیسا کہ عام تاریخوں نے درج کیا ہے۔ چاہے پیغمبر خدا ہی نے قبیلہ اوس کو مطمئن کرنے کے لئے جناب سعد بن معاذ کا نام پیش فرمایا ہو اور چاہے جیسا علامّہ طبرسی نے لکھا ہے اور اب ہمارے مورخین بھی کم از کم ہندوستان کے لکھنے والے سب یہی لکھ رہے ہیں، خود جماعت یہود نے سعد کے حَکم بنانے کی خواہش کی ہو اور آپ نے اُسے قبول فرمایا، بہر صورت جب سعد بن معاذ کے فیصلہ کو حضرتؐ نے تسلیم فرمالیا اور اُس کے مطابق عمل کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا اور رسولؐ کے نزدیک وہ جماعت اس سزا کی مستحق تھی اور ایسی صورت میں اگر سعد کا قدم درمیان میں آتا ہی نہ اور خود پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی فرماتے تو بھی کیا تھا؟

کیا آپ نے فساد فی الارض کے مرتکب افراد کو اور ملک میں قتل و غارت برپا کرنے والوں کو ایسی سخت سزائیں خود نہیں دی ہیں؟ اور کیا قرآن مجید میں صراحۃً "اللہ اور رسولؐ سے جنگ کرنے والوں" اور "فساد کی کوشش کرنے والوں" کو اس سزا کا مستوجب نہیں ٹھہرایا ہے کہ

ان یقتّلوا او یصلّبوا او تقطّع ایدیھم و ارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض	اُنھیں طرح طرح سے قتل کیا جائے یا اُنھیں سُولی دی جائے یا اُن کے اِدھر اُدھر سے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں یا (کم از کم) اُنھیں اس سرزمین سے نکال دیا جائے۔

دو اہم واقعے

اِس ذیل میں تاریخ کے دو اہم واقعے ہمارے سامنے آتے ہیں جن سے ہمیں اس بحث میں واقعہ کی اصل نوعیت تک پہونچنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ جب محاصرہ کی شدت سے بنی قریظہ عاجز ہو گئے تو اُنھوں نے جنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا اور کہا ہم کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "اچھا جو کہنا ہو کہو" ـــــ اُنھوں نے اپنے ایک آدمی کو جس کا

نام نباش ابن قیس تھا رسولؐ کے پاس بھیجا اور اُس نے آپ سے درخواست کی کہ ہم اس شرط پر ہتھیار ڈالنے کو تیار ہیں کہ ہمارے ساتھ وہی سلوک ہو جو بنی نضیر کے ساتھ ہوا تھا کہ ہمارے تمام املاک اور سامان جنگ کے مالک آپ ہو جائیں اور ہمیں بس جانوں کی اماں دے دیں کہ ہم یہاں سے اپنی عورتوں اور بچوں کو لے کر نکل جائیں اور سامان جنگ کو چھوڑ کر جتنا مال اونٹوں پر بار ہو سکے وہ اپنے ساتھ لے جائیں۔ اس پر رسولؐ خدا نے انکار فرما دیا۔ اُنھوں نے کہا اچھا! بس عورتوں اور بچوں کے ساتھ ہم نکل کر چلے جائیں اور سامان کچھ بھی نہ لے جائیں۔ آپ نے فرمایا یہ کچھ نہیں۔ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالو کہ جو چاہوں میں فیصلہ کر دوں۔ اس پر نباش نا اُمید ہو کر واپس گیا اور جا کر اُنھیں رسولؐ کے جواب کی اطلاع دے دی۔[۱]

دوسرا اس سے بھی زیادہ اہم ابو لبابہ کا واقعہ ہے جو تمام تاریخوں میں متفق علیہ صورت سے درج ہے۔

ابو لبابہ بن عبد المنذر بھی قبیلۂ اوس کے معزز افراد میں سے تھے جن سے بنی قریظہ کے خاص تعلقات تھے۔ جب پیغمبر خداؐ نے انھیں قطعی طور پر جواب دے دیا کہ تمھاری کوئی شرط منظور نہیں ہے تو اُنھوں نے کہلوا بھیجا کہ بھیجا! آپ ابو لبابہ کو ہمارے پاس بھیج دیجئے

[۱] المغازی للواقدی ج ۲ ص ۵۰۱

بھیجئے۔ حضرتؐ نے اُنھیں بُلاکر فرمایا کہ تمھارے حلیفوں نے پورے قبیلۂ اوس میں سے تمھارا نام لے کر تمھیں بُلایا ہے۔ جاکر سُن لو۔ وہ کیا کہتے ہیں؟

ابولبابہ جو گئے تو وہ سب سمٹ کر اُن کی طرف آ گئے اور انھیں سابقہ تعلقات جو قبیلۂ اوس سے رہے ہیں اور جس جس طرح اُنھوں نے مختلف مواقع پر قبیلۂ اوس کی مدد کی تھی یاد دلائے اور کہا کہ اب محاصرہ کی شدت کے ہماری جان لبوں تک آ گئی ہے اور رسول خداؐ ہمارے قلعہ سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جب تک کہ ہم غیر مشروط طور پر اپنے کو اُن کے فیصلہ پر چھوڑ کر ہتھیار نہ ڈال دیں۔ اب ہم تم سے رائے لینا چاہتے ہیں کہ کیا ہم محمدؐ کے فیصلہ پر انحصار کر کے ہتھیار ڈال دیں۔ تاریخیں کہتی ہیں کہ اُنھوں نے زبان سے کہا "ہاں" اور اس کے ساتھ ہاتھ اپنے حلق پر پھیر کے اشارہ کیا کہ نتیجہ ذبح ہونے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور اس کے بعد ہی اُنھوں نے فوراً اپنی غلطی کا احساس کیا کہ میں نے پیغمبرِ اسلام کے ساتھ ایک طرح کی خیانت کی ہے جس کے نتیجہ میں پیغمبر خداؐ یا مسلمانوں کے مجمع میں آنے کے بجائے سیدھے مسجد میں جا کر اُنھوں نے اپنے کو ایک ستون مسجد سے بندھوا لیا اور گریۂ وزاری کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں توبہ وانابت کرنے لگے۔ حضرت پیغمبر خداؐ کو اُن کی کیفیت معلوم ہوئی تو فرمایا کہ اگر وہ سیدھے میرے

پاس آجاتے تو میں اُن کے لئے بارگاہ الٰہی میں مغفرت کی دعا کر دیتا مگر جب وہ میرے پاس نہیں آئے تو اب اللہ ہی اُن کے بارے میں جو فیصلہ کرنا ہوگا وہ کرے گا۔ پندرہ دن تک وہ اِسی عالم میں رہے یہاں تک کہ روایتیں بتاتی ہیں کہ کمزوری کی وجہ سے اُن کی آواز نہیں نکلتی تھی اور اُن کی بات مشکل سے سمجھ میں آتی تھی۔ اس کے بعد وحی الٰہی اُن کے بارے میں آئی اور رسولؐ نے اُن کی توبہ قبول ہونے کا اعلان فرمایا۔ لوگ جلدی سے آئے کہ اُنھیں اُس ستون سے کھول کر الگ کریں مگر اُنھوں نے انکار کیا اور کہا جب تک رسولؐ خود مجھے آزاد نہیں کریں گے میں رہا نہیں ہوں گا آخر حضرتؐ خود تشریف لائے اور اُنھیں قبول توبہ کا مژدہ سُناتے ہوئے اپنے ہاتھ سے رہا فرمایا۔[۱]

تبصرہ

مذکورۂ بالا دونوں واقعوں پر جب ہم غور کرتے ہیں تو حسب ذیل نتائج واضح طور پر برآمد ہوتے ہیں:-

(۱) بنی قریظہ کی اس خواہش کو کہ ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو بنی نضیر کے ساتھ ہوا تھا، اور پھر صراحتہً اُن کی اس خواہش کو بھی کہ ہمیں جان کی امان دی جائے اور صرف عورتوں

---

[۱] واقدی ج ۲ ص ۵۰۵ و ص ۵۰۷

اور بچوں کے ساتھ چلا جانے دیا جائے حضرت نے مسترد فرما دیا اس کے بعد یہ کیونکر سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرتؐ بذاتِ خود اُن کے بارے میں فیصلہ فرماتے تو وہ اُس سے مختلف ہوتا جو سعد بن معاذ نے فیصلہ کیا۔

(۲) آپ کا یہ رجحان کہ آپ بنی قریظہ کو امان دینے کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں عام طور پر اصحاب کو معلوم ہو چکا تھا اور اس لئے ابولبابہ نے جو بنی قریظہ کی خواہش پر وہاں بھیجے گئے تھے اُن کے اس سوال پر کہ کیا ہم رسولؐ کے فیصلہ پر انحصار کر کے ہتھیار ڈال دیں زبان سے تو "ہاں" کہہ دیا مگر اشارہ سے ظاہر کر دیا کہ اس کا نتیجہ قتل ہونے کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اسی لئے زمانہ حال کے بعض مصنفین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قدیم تاریخوں میں "ہاں" کی لفظ یہاں پر غلط درج ہوئی ہے۔ اصل میں انھوں نے "نہیں" کہا ہوگا۔ کیونکہ "ہاں" کے ساتھ گلے پر تلوار پھرنے کے اشارہ کا جوڑ نہیں ہے مگر ہمارے خیال میں یہ درست نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ تحریر میں تو لفظ آتی ہے۔ کہنے والے کا لب و لہجہ نہیں آتا۔ گلے پر چھرا پھرنے کے اشارہ کے ساتھ "ہاں" کہنے کا انداز ایسا ہو سکتا ہے جس کا مطلب "نہیں" ہوتا ہو اور اس طرح اُنھوں نے بنی قریظہ کو صحیح صورتِ حال بتا کر حقِ دوستی ادا کر دیا جس پر بعد میں وہ بتقاضائے ایمان پشیمان ہوئے۔ حالانکہ اس سے اسلام یا پیغمبرؐ کو کوئی نقصان نہیں پہونچ رہا تھا۔ اسی لئے رسولِ خداؐ نے بذاتِ خود اُسے

کوئی سنگین جرم نہیں سمجھا اور فرمایا کہ میرے پاس آتے تو میں اُن کے لئے بارگاہ الٰہی میں استغفار کر دیتا۔ بہر حال اُن کے اس اظہارِ حقیقت سے جو اُنھوں نے بنی قریظہ سے کیا یہ نمایاں ہو جاتا ہے کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارادہ اُن کی نسبت اصحاب کے علم میں ایسا ہی تھا جیسا بعد میں سعد بن معاذ کے فیصلہ سے ہوا۔

(۳) جب کہ اُنھوں نے ابولبابہ کو مشورہ کے لئے بُلایا تھا اور ابولبابہ نے اُنھیں پیغمبرِ خدا کے فیصلہ پر انحصار کا نتیجہ صفائی کے ساتھ بتا دیا تھا تو پھر اُن سے اس صریحی مشورہ کے خلاف اُنھوں نے ایک دم رسولؐ ہی کے فیصلہ پر انحصار کر کے ہتھیار کیوں ڈالے ہوں گے؟ لہٰذا قدیم مورخین کا یہ کہنا کہ اُنھوں نے رسولؐ کے فیصلہ پر انحصار کیا۔ اس واقعہ سے قطعی میل نہیں کھاتا۔

ان اُمور پر نظر کرتے ہوئے بحیثیت واقعہ ہمارے نزدیک ترجیح تو علامہ طبرسی ہی کے قول کو ہے کہ یہودیوں نے ہی جناب سعد بن معاذ کو حکم بنا کر اُن کے فیصلہ پر انحصار کیا۔ کیونکہ یہ دیکھا جا چکا کہ اُنھیں قبیلۂ اوس کے ساتھ اپنے روابط پر پورا بھروسہ تھا اور اس بھروسے کا ثبوت مل گیا اس سے کہ اُنھوں نے ابولبابہ کو جو قبیلۂ اوس میں ایک معزز حیثیت رکھتے تھے مشورہ لینے کے لئے بُلایا۔

ممکن ہے کہ اُنھیں اس طرح یہ دیکھنا بھی ہو کہ قبیلۂ اوس اب بھی اپنی دوستی پر قائم ہے یا نہیں اور اُن کے اس اعتماد میں قوت پیدا ہو گئی۔ جناب ابو الباب کے اس عمل سے کہ انھوں نے اُنھیں صحیح صورتِ حال سے مطلع کر دیا کہ رسولؐ کا اُن کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟ اس کے بعد اُنھیں رسولؐ کے فیصلہ پر انحصار کے بجائے کوئی ایسی راہ ڈھونڈھنا تھی کہ اُنھیں امان مل سکے۔ وہ جانتے تھے کہ ابو لبابہ معزز حیثیت کے شخص سہی مگر قبیلہ کے سردار جناب سعد بن معاذ ان سے بڑی شخصیت رکھتے ہیں اور اُنھیں حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں رسوخ بھی زیادہ حاصل ہے اس کے لئے اُنھوں نے ابو لبابہ کے رجحان سے یہ اندازہ کر لینے کے بعد کہ قبیلۂ اوس کے دل میں ہماری جگہ باقی ہے۔ اب جناب سعد بن معاذ کو اپنے بارے میں ثالث کے لئے تجویز کیا اس امید کے ساتھ کہ وہ ہمارے ساتھ دوستی کے حقوق کا لحاظ کرتے ہوئے نرمی ضرور برتیں گے اور رسول خداؐ شائد اُن کی تجویز کو مسترد نہ فرمائیں گے۔ اس لئے سعد بن معاذ کا نام بحیثیت حکم کے تجویز انھوں نے ہی کیا اور رسول خدا نے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا۔ اُن کے اخلاص ایمانی پر اعتماد فرماتے ہوئے اُسے منظور کر لیا مگر سعد نے فیصلہ جو کیا وہ بنی قریظہ کے توقعات کے خلاف تھا اور وہ وہ تھا جو خالق کی طرف سے

اُن کے لئے مقدر ہو چکا تھا اور وہ اُس کے مستحق تھے۔

اس لئے یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ خود رسولؐ پر معاملہ چھوڑ دیا گیا ہوتا تو رسولؐ اس سے مختلف کچھ فیصلہ فرماتے بلکہ یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسولؐ بھی یہی فیصلہ فرماتے۔

اب جو فیصلہ رسول فرماتے وہ سعد بن معاذ کی زبان سے ہوا جس کے بعد قدیم مورخین کے بیان کے مطابق قبیلۂ اوس کی زبان بندی ہو گئی اور علامہ طبرسی، نیز حال کے اُردو تاریخ نگاروں کی تحریر کے لحاظ سے خود بنی قریظہ کو چون وچرا کا موقع نہ رہا اس لئے کہ خود اُن کے منتخب کردہ حکم نے یہ فیصلہ کیا۔

انجام کار

بدنصیب بنی قریظہ کا انجام بلاشبہ بڑا عبرت ناک ہوا۔ جب انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور مجبور ہو کر قلعہ کے دروازے کھول دیے تو پیغمبر خدا کے حکم سے سب کی مشکیں باندھ لی گئیں اور اُن سب کو ایک جگہ کر دیا گیا۔ اور عورتوں اور بچوں کو نکال کر دوسری طرف۔ پھر حکم ہوا کہ اُن کے تمام اموال، اثاثہ اور اسلحہ کو جمع کیا جائے۔

تاریخ نے اس موقع پر اسلحہ کی پوری تفصیل دی ہے جس سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ کی

کبھی تیاری کی تھی۔ پندرہ سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے اور پانچ سو مختلف قسم کی سپریں۔ اس سب کے علاوہ شراب کا بہت ذخیرہ بھی تھا جسے رسولؐ کے حکم سے بہا دیا گیا اور تمام سامان باہر نکال کرلے آیا گیا۔[1]

اب سعد بن معاذ کے فیصلہ کی اُن کے بارے میں جو دراصل قدرت کا فیصلہ تھا تکمیل ہونا تھی۔

اُس دن مردوں کو ایک مکان میں بھیج دیا گیا جو اسامہ بن زید کا تھا اور عورتوں اور بچوں کو ایک خاتون کے مکان میں جو بنت حارث کہلاتی تھیں اور پیغمبر خداؐ کے حکم سے کھجور کے ٹوکرے دونوں جگہ بھیج کر پھیلا دیے گئے جن پر دونوں جگہ کے قیدی ٹوٹ پڑے اور سب نے شکم سیر ہو کر اُن کھجوروں کو کھایا جو عربوں کی ایک عام اور دل پسند غذا تھی۔[2]

اسلحۂ جنگ اور سامان و اسباب کو بھی بنت حارث کے مکان میں بھیجا گیا اور اونٹ نیز مویشی سب درختوں کے نیچے چرنے کے لئے چھوڑ دیے گئے۔ یہاں تک کہ یہ رات گزری اور دوسرے دن کی صبح طالع ہوئی۔

اب حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بازار کی طرف تشریف لائے اور حکم دیا کہ جا بجا گڑھے کھودے جائیں۔ بہت سے

---

[1] واقدی ج صـ ۵۰۹ [2] واقدی ج ۲ صـ ۵۱۲

اصحاب گڑھوں کے کھودنے میں مصروف ہو گئے اور حضرت مخصوص اصحاب کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ گئے۔ اتنی دیر میں گڑھے تیار ہوئے اور بنی قریظہ کے لوگوں کا ایک ایک دستہ لایا جاتا اور اُن کی گردنیں قلم ہوتی رہیں اور اس کام کو حضرت علی ا زبیر انجام دے رہے تھے۔

بنی نضیر کا سردار حیی بن اخطب خاص طور پر رسولؐ کے سامنے لایا گیا۔ حقیقتہً یہی تھا جس نے بنی قریظہ کو اس مہلکہ میں تھا جس کی تفصیل پہلے آچکی ہے۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد اس بھی گردن مار دی گئی۔

یہ سلسلہ دوپہر تک جاری رہا۔ اب دھوپ کی شدت ا گرمی کی زیادتی ہو گئی۔

رسولؐ کے طرزِ عمل سے یہ بات نمایاں ہے کہ یہ ایک ناخوش فریضہ ہے جو مجبوراً ادا کیا جا رہا ہے اُن جرائم کی شدت بنا پر جن کا اُنھوں نے ارتکاب کیا تھا مگر اس کے ساتھ انتقام یا دشمنی کا جذبہ قطعاً نہیں ہے چنانچہ اُن لوگوں پر جو کئے جا رہے ہیں رسولؐ کی طرف سے ترحم کے جذبات بھی کار ہیں۔ آپ نے فرمایا بس اب گرمی زیادہ ہو گئی ہے۔ انھیں سایہ لے جاؤ اور لیٹنے کا موقع دو اور ٹھنڈا پانی پلاؤ کہ انھیں سکو ملے۔ پھر جو باقی رہ گئے ہیں دوسرے وقت انھیں قتل کرنا گرا

نہ کرو کہ سورج کی گرمی اور ہتھیار کی گرمی دونوں کو اُن پر اکٹھا کر دو۔" چنانچہ اصحاب اُنھیں لے گئے، آرام کی جگہوں پر رکھا اور کھانا پانی پہونچایا۔ جب ٹھنڈا وقت ہوا تو رسولؐ پھر برآمد ہوئے۔ اور باقی افراد کو بُلا کر اُنھیں قتل کرایا۔[۱]

ان مقتولین کی تعداد ساڑھے سات سَو تک بتائی گئی ہے۔[۲] اموالِ غنیمت، نیز عورتوں اور بچّوں کو کنیزوں اور غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر دیا گیا جن کی تعداد ایک ہزار تھی۔[۳]

اس میں پیغمبرِ خداؐ کی طرف سے یہ تاکید کی گئی کہ کسی ماں سے اُس کے بچّہ کو اُس وقت تک جُدا نہ کیا جائے جب تک وہ حدِ بلوغ تک پہونچ نہ جائے۔[۴]

جناب سعد بن معاذ کی وفات:-

سعد بن معاذ کی دعا کی حیرت انگیز قبولیت کا ثبوت ہے کہ قضائے الٰہی ان کے بارے میں اُن کی خواہش کے مطابق اس منظر کے آنکھوں سے دکھا دینے کی منتظر رہی۔ اس کے بعد وہ زخم جو اُنھیں جنگِ خندق میں آیا تھا پھٹ گیا جس سے خون جاری ہو گیا اور بند نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے وفات پائی۔ حضرتؐ نے اُن کے غم کو اتنی اہمیت دی کہ آپ نے رِداد دوشِ مبارک

---

[۱] واقدی۔ ج ۲ ص ۵۱۲ [۲] ایضاً ص ۵۱۸ [۳] ص ۵۲۳ [۴] ص ۵۲۳

سے اُتار دی۔ اور اُن کی لاش کے ساتھ پیادہ پا چلتے رہے یہاں تک کہ قبر تک پہونچایا اور وہ دفن ہو گئے[۱]

آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان کی موت سے عرش خدا ہلنے لگا[۲]

کچھ چھوٹی مہمیں

بنی قریظہ کے خاتمہ کے بعد تھوڑے عرصہ تک کچھ چھوٹی چھوٹی مہیں جاری رہیں جیسے :-

غزوۂ ذِی قَرَد :-

اسے مولوی عبدالباری ایم۔ اے نے ذی الحجہ ۶ھ یا محرم ۷ھ میں بتایا ہے مگر یہی تاریخ انھوں نے جنگ خیبر کی بھی لکھی ہے[۳] جو صلح حدیبیہ کے بعد ہے مگر دوسرے مورخین نے غزوۂ ذی قرد کا وقوع ۶ھ کے ماہ ربیع الاول میں بتایا ہے[۴] اور حدیبیہ کی صلح اس سال کے ماہ ذیقعد میں ہوئی ہے اور پھر ۷ھ کے شروع میں جنگ خیبر ہے۔

ذو قرد (ق اور ر دونوں کے فتحہ کے ساتھ) شام کی راہ میں مدینہ

---

[۱] اعلام الوری [۲] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۱

[۳] دعوت دہلی سیرت طیبہ نمبر ۱۶ ستمبر ۱۹۵۹ء ۱۲ ر ع ۱ ۱۳۷۹ھ ص ۱۸۳

[۴] اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۲۴۵

سے ایک منزل دور ایک چشمہ کا نام تھا۔ وہیں یہ جنگ ہوئی تھی[۱]۔

غزوہ دُومۃ الجندل:-

یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو کوفہ اور دمشق کے درمیان ہے اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ حضرتؐ کو خبر ملی کہ یہاں ایک کثیر جمعیت اکٹھا ہو گئی ہے جس نے اس طرف سے گزرنے والے قافلوں کے لئے خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ سن کر حضرتؐ ایک ہزار مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ اُن کے تدارک کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ کی آمد کی خبر سن کر ہی وہ پوری جماعت منتشر ہو گئی۔ حضرتؐ نے وہاں چند روز قیام فرما کر ضروری انتظامات فرمائے اور ایک مہینے سے بھی چند دن زیادہ کی مدّت اِس سفر میں گزارنے کے بعد مدینہ واپس ہوئے[۲]۔

غزوہ بنی لحیان

اس کے لئے محدث دہلوی نے بتایا ہے کہ وہ سنہ ۶ھ کے ربیع الاول یا جمادی الاول میں واقع ہوا اور بعض نے کہا ہے کہ سنہ ۵ھ میں نتیجۃً یہاں بھی بغیر جنگ مخالفین نے فرار اختیار کیا۔ اور رسولؐ نے ۱۴ دن کے بعد مراجعت فرمائی[۳]۔

---

[۱] اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۲۴۵ [۲] مدارج النبوۃ، ج ۲ ص ۲۵۰-۲۵۱

[۳] مدارج النبوۃ، ج ۲ ص ۲۵۵-۲۵۶

غزوۂ بنی مصطلق :-

تاریخ میں ہے کہ پھر پیغمبر خدا نے شعبان ۶ھ تک مدینہ میں قیام فرمایا۔ اس کے بعد غزوۂ بنی مصطلق وقوع میں آیا[۱]۔ ابن العماد حنبلی نے بھی اس غزوہ کا ۶ھ کے واقعات میں ذکر کیا ہے[۲]۔

یہ وہ مہمیں ہیں جن میں خود پیغمبر خدا تشریف لے گئے اس لئے وہ اصطلاحاً غزوہ کہلاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ سرایا ہیں یعنی ایسی مہمیں ہیں جن میں صحابہ میں سے کسی کو سردار بنا کر بھیج دیا گیا ہے۔ ان میں کوئی خاص اہمیت ایسی نہیں ہے کہ ان کا یہاں کوئی تفصیلی تذکرہ کیا جائے۔

---

[۱] تاریخ ابن خلدون مطبوعہ ۱۹۶۵ء ج ۲ ص ۲۸۱

[۲] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۱

maablib.com

معرکۂ حُدَیبیہ[۱]

حدیبیہ کے معرکہ کہنے پر لوگوں کو جو اُس کی ......
نوعیت سے سطحی طور پر واقف ہیں تعجب ہوگا مگر میں اُسے بہت
بڑا معرکہ سمجھتا ہوں اور حقیقتہً وہ بڑا معرکہ ہے اس اعتبار
سے کہ اُس میں صبر و ثبات اور ایمان و استقامت کا اتنا بڑا
امتحان ہوا جیسا کسی دوسرے اُس معرکۂ کارزار میں بھی نہ تھا
جہاں جانوں کی بازی لگانا پڑتی ہے۔

اِس کی تفصیلی کیفیت مجملاً ذیل میں درج کی جاتی ہے جس
میں لازماً کچھ وہ واقعات درج ہوں گے جنھیں میں نے خود اپنی
دوسری کتابوں میں درج کیا ہے اور اُن پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

واقعہ کا پسِ منظر :-

پہلے پسِ منظر اس معرکہ کا مسٹر کے۔ اے حمید بی اے (لندن)
بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور کی لفظوں میں سنئے :

"اگرچہ مسلمانوں کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو چکی تھی
تاہم وہ بآسانی مکہّ نہیں جا سکتے تھے۔ اُن کے دلوں میں
ہر سال حج کی تڑپ اُٹھتی اور نہایت بیقرار کرتی ایک روز
حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے، کہ میں اور تمام

---

[۱] بالتخفیف (یعنی بغیر تشدید یا) (اعیان الشیعہ ج ۲ صفحہ ۳۴۷)

صحابہ خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے ہیں، خواب سُن کر مسلمان پہلے سے زیادہ بے چین ہو گئے۔[1]"

یہیں یہ سمجھ لیجئے کہ اِس خواب سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ منظر اسی سال سامنے آئے گا۔ اس لئے اگر بعد میں ناگزیر اسباب کی بنا پر اس سال راستے ہی سے واپسی ہو جائے تو ایمان بالرسالۃ کا مطالبہ یہی ہے کہ یہ یقین رکھا جائے کہ اب کی نہ سہی تو اس کے بعد یہ منظر سامنے آکر رہے گا لیکن اُس وقت کے مسلمانوں کی اکثریت اس نکتہ کو نہ سمجھ سکی اور اس طرح یہ معاملہ ایک بڑے ابتلاء کا ذریعہ بن گیا جس کی کیفیت بعد میں آئے گی۔

یہ بھی شائد اسی امتحان کے مقصد سے ایک حکمت الٰہی تھی کہ اس موقع پر ہمارے رسولؐ کے لئے جو عام طریقہ وحی کا تھا کہ ملک آئے اور پیغام الٰہی پہونچائے، یہ صورت اختیار نہیں کی گئی یعنی یہ نہیں ہوا کہ فرشتے نے آکر یہ فرمان الٰہی رسولؐ تک پہونچایا ہو کہ آپ اس سال جا کر مناسک حج کو انجام دیجئے۔ بلکہ خالق نے خواب دکھلا کر یہ تحریک پیدا کر دی کہ مسلمان اپنے مدّت سے چھپے ہوئے اضطراب کی بنا پر جو کعبہ کو دیکھنے کے اشتیاق سے ہے پیغمبر خدا سے اصرار کریں کہ بس اب جلدی تشریف لے چلئے اور پھر کشاں کشاں وہ سب صورتیں سامنے آئیں جن کے نتیجہ میں رسولؐ کی رواداری

---

[1] تاریخ مسلمانانِ عالم حصۂ اول ص۷۹-۸۰

دنیا کے سامنے آئے اور مشرکین سے عدم تعرض کا ایک کافی مدت تک کے لئے معاہدہ ہو جس کے نتیجہ میں پُرامن فضا میں اسلامی ترقی کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوں یہ سب اسباب اس ایک خواب سے فراہم ہوئے جو رسولِ خداؐ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مبہم انداز میں دیکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے زمانہ حج کے آنے کا انتظار بھی نہ کیا اور قبل ہی بطور عُمرہ پیغمبر خدا کو چلنے پر آمادہ کر دیا۔ چنانچہ حضرتؐ یکم ذیقعد ۶ھ؁ کو مدینہ منوّرہ سے روانہ ہوئے۔[۱]

ممکن ہے اس میں رسول خداؐ کی طرف سے بھی امن پسندی کا یہ پہلو مضمر ہو کہ ہم اُس موقع پر جب تمام قبائل کا مکّہ میں ہجوم ہوتا ہے آکر کچھ سیاسی مقصد حاصل کرنا چاہتے بلکہ اُس کے بعد ہی جب کہ مکّہ کی وادی خالی ہوتی ہے سکون و خاموشی کے ساتھ جاتے ہیں۔ زیارت مکّہ معظمہ کے آداب و رسوم انجام دے لیں۔

مسلمانوں کی جمعیت جو حضرتؐ کے ساتھ تھی چودہ سو آدمیوں کی تھی۔[۲] جیسا کہ خواجہ محمد لطیف صاحب نے لکھا ہے :۔

"تلوار کے سوا کوئی اسلحہ کسی مسلمان کے پاس نہیں تھا اور تلوار ایک ایسا ہتھیار تھا جسے عرب کسی حالت میں اپنے جسم

---

[۱] تاریخ خمیس ج ۲ ص۱۶ [۲] تاریخ ابن الوردی ج ص۱۴۲

ے الگ نہیں کرتے تھے"۔[1]

پھر یہ کہ آپ کے ساتھ ستر بدنے (قربانی کے اونٹ) تھے[2] جس سے صاف ظاہر تھا کہ آپ لڑائی کے لئے نہیں جارہے ہیں مگر جب قریش کو رسولؐ کے آنے کی خبر پہونچی تو وہ خالد بن ولید کی قیادت میں "کراع الغمیم" کے مقام تک رسولؐ کا راستہ روکنے کے لئے نکل آئے۔

جیسا کہ ہم نے "شہید انسانیت" میں لکھا ہے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی ہمتیں اس کے قبل کے حاصل شدہ پے درپے فتوحات سے بڑھی ہوئی تھیں اور سامنے وہی شکست خوردہ جماعت تھی جو اس وقت جنگ کے لئے پہلے سے تیار بھی نہ تھی اس لئے یہ بہت آسان تھا کہ رسولؐ مقابلہ کا حکم دے دیتے اور فاتحانہ صورت سے مکہ میں داخل ہوتے مگر پیغمبر اسلامؐ کو امن پسندی کا ثبوت دینا تھا۔ جونہی گرد و غبار اُٹھتا ہوا نظر آیا۔ آپ نے فرمایا اس راستے کو چھوڑ دو کسی دوسرے راستے سے آگے نکل چلو۔ چنانچہ دائیں جانب کا رُخ کیا گیا اور آپ "حمض" کی پشت پر سے "ثنیۃ المرار" ہوتے ہوئے حُدیبیہ کو جو راستہ جاتا ہے، اُدھر متوجہ ہوئے۔[3]

---

[1] اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ ج ۱ ص ۱۲۰-۱۲۱

[2] طبری ج ۳ ص ۷۳ [3] طبری ج ۳ ص ۷۳

مسٹر کے، اے حمید لکھتے ہیں :-

"عربی قانون کے مطابق حج کے ایام میں ہر شخص کو حق حاصل تھا کہ وہ آزادی سے فریضۂ حج ادا کرے مکہ ابھی نو میل کی مسافت پر تھا کہ یہ قافلہ حدیبیہ کے مقام پر قیام پذیر ہوا اور حضرت عثمان کو بطور سفیر مکہ روانہ کیا کہ حج کے شرائط اہل مکہ سے طے کرائیں[۱]"

مگر جب عربی قانون کے مطابق ہر شخص کو حق تھا تو اس کے لئے کسی کو شرائط عائد کرنے کا کیا حق تھا اور پھر شرائط طے کرانے کے لئے کسی کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟

بلکہ صحیح وہ معلوم ہوتا ہے جو تاریخ ابن وردی میں ہے کہ آپ نے ایک قاصد بھیجا یہ اطلاع دینے کے لئے کہ ہم جنگ کے واسطے نہیں آئے، صرف خانۂ کعبہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ پہلے آپ نے حضرت عمر کو بلایا کہ تم جا کر انھیں یہ اطلاع دو۔ اُنھوں نے مشرکین سے اپنے لئے خطرہ ظاہر کرتے ہوئے تعمیل ارشاد سے معذوری ظاہر کی۔ اب حضرتؐ نے جناب عثمان کو بلایا۔ وہ چونکہ بنی اُمیہ ہی میں سے تھے تو وہ سیدھے اپنی برادری والوں کے پاس گئے اور ابو سفیان کو حضرتؐ کا پیغام پہونچا دیا۔ مشرکین نے کہا کہ تم طواف کرنا چاہو تو کرسکتے ہو مگر

---

[۱] اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ۔ ج ۱ ص ۱۳۰-۱۳۱ [۲] طبری ج ۳ ص ۷۳

اُنھوں نے کہا نہیں، مَیں بغیر رسولِ خداؐ کے طواف نہیں کروں گا، یہ سن کر اُنھوں نے حضرت عثمان کو قید کر لیا[1]

اسی مضمون کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس طرح لکھا ہے:

خواجۂ عالم روئے بعمر خطاب آورد و گفت ترا بکہ باید رفت ومعقول ساخت کہ ما داعیہ جنگ نداریم و بزیارت عمرہ آمدہ ایم۔ عمر گفت یا رسول اللہؐ بر حضرت روشن است کہ عداوت قریش با من درچہ درجہ است و شدت و غلظت من باین قوم درچہ مرتبہ اگر بر من دست یابند بے شک زندہ نہ گزارند و در مکہ از بنی عدی کسے نیست کہ مرا از شر ایشاں حمایت کنند و صیانت نماید، اگر عثمان بن عفان را فرستی مناسب تر می نماید کہ وے بنزد قریش عزیز تر است و اقارب و عشایر او در مکہ بسیار اند[2]

سرورِ کائناتؐ حضرت عمرؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تمھیں مکہ جانا ہے اور اُنھیں سمجھانا ہے کہ ہم جنگ کی خواہش نہیں رکھتے اور صرف عمرہ بجالانے کے لیے آئے ہیں۔ عمر نے کہا یا رسول اللہؐ آپ پر ظاہر ہے کہ قریش کو مجھ سے کس درجہ دشمنی ہے اور میری سختی اس قوم کے خلاف کس حد تک رہی ہے۔ اگر میں اُن کے ہاتھ آجاؤں تو بلاشبہ زندہ نہیں چھوڑیں گے اور مکہ میں میرے قبیلہ عدی کا کوئی شخص نہیں ہے جو مجھے اُن کے شر سے بچائے اور میری حفاظت کرے اگر عثمان بن عفان کو بھیجیے تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ قریش کو زیادہ عزیز ہیں اور اُن کے قوم قبیلہ والے مکہ میں بہت ہیں۔

[1] ابن الوردی ط مصر ۱۲۸۵ھ ج ۱ ص ۱۲۵

[2] مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۲۸۱

معلوم ہوا کہ جناب عثمان کوئی شرائط طے کرانے نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ صرف رسول ؐ کی تشریف آوری کی نوعیت بتانے کے لئے گئے تھے۔

مسٹر اے، کے حمید لکھتے ہیں :-

"وہ اپنے ایک عزیز ابان بن سعید کی حمائت میں مکہ گئے اور رسول اللہ ؐ کا پیغام سنایا۔ قریش نے اُن کو نظر بند کر لیا لیکن افواہ یہ پھیل گئی کہ اہل مکہ نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا ہے اس سے مسلمانوں میں بہت ہیجان و جوش پیدا ہو گیا۔ اگرچہ وہ بغیر ہتھیار کے آئے تھے۔ تاہم وہ مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔[۱]"

اگرچہ اس مصنّف کا قلم عموماً غلط راہوں پر جاتا ہے مگر یہاں اتفاقاً نوعیت واقعہ کے اظہار میں اُس کے قلم سے صحیح الفاظ نکل گئے ہیں، برخلاف پہلے کے اُن موّرخین کے جنھوں نے اس کی نسبت براہِ راست رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دی ہے کہ آپ کو قتل عثمان کی غلط خبر پہونچی تو آپ نے یہ طے کر لیا کہ اب ان سے جنگ کرنا ضروری ہے۔[۲]"

بعد میں جو بیعت لی گئی ہے وہ بھی درحقیقت اس کی مظہر ہے کہ مسلمان خود جنگ پر مصر تھے۔ اور پُرجوش طریقہ پر مطالبہ کر رہے تھے کہ بس اب حملہ کر دیجئے مگر اس کے پہلے اُحد کے معرکہ میں جو

۱؎ مسلمانانِ عالم ج ۱ صف۸
۲؎ تاریخ ابن الوردی ج ۱ ص۱۲۵

تلخ تجربہ ہو چکا تھا اُس کے پیشِ نظر اب ضرورت سمجھی گئی کہ دوبارہ ان لوگوں سے بیعت کی تجدید کی جائے اس شرط کی صراحت کے ساتھ کہ وہ میدانِ جنگ سے فرار نہیں کریں گے۔

عام حالات میں ایسے بہادروں کے لئے جو ہمیشہ جان کی بازی لگاتے رہے ہوں اس قسم کی شرط باعث ننگ محسوس کرتے ہوئے بارِ خاطر ہونا چاہیئے تھی مگر کیا کیا جائے کہ اکثریت اپنے کردار کی اس میں نشیب محسوس کر رہی تھی اس لئے جوشِ جنگ میں وہ اس شرط پر بیعت کرنے کے لئے بھی بلا تکلف تیار ہو گئی۔

اسی کو بعض لوگوں نے اندازِ تعبیر میں ذرا خوشنمائی پیدا کرنے کے لئے یوں کہا کہ یہ بیعت "موت" پر لی گئی، جیسے مسٹر کے، اے حمید نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ:

"ایک درخت کے نیچے چودہ سو آدمیوں نے بیعت کی کہ اگر ضرورت ہو تو اسلام پر جان دینے کے لئے تیار ہیں[1]"

تاریخوں سے پتہ لگتا ہے کہ قدیم زمانہ ہی کے بعض راویوں نے "فرار" کے تلخ تذکرہ سے بچتے ہوئے اس تعبیر کو اختیار کیا تھا۔ مگر جناب جابر بن عبداللہ انصاری ایک معزز صحابی نے اس پردہ کو بالکل چاک کر کے جو بات تھی وہ صاف کہدی۔

ابن الوردی رقم طراز ہیں:-

---

[1] تاریخ مسلمانانِ عالم ج ۱ ص ۸

كان يقال بايعهم رسول اللهؐ على الموت وكان جابر يقول لم يبايعنا الا على اننا لا نفرؑ

کہا جاتا تھا کہ پیغمبر خداؐ نے اُن سے موت پر بیعت لی اور جابر کہا کرتے تھے کہ رسولؐ نے ہم سے بیعت نہیں لی مگر اس بات پر کہ ہم بھاگیں گے نہیں۔

ابو الفداء کے الفاظ ہیں:-

كان الناس يقولون بايعهم رسول الله صلے اللہ علیه وسلم على الموت وكان جابر يقولؐ لم يبايعنا الا على اننا لا نفرؑ۔

لوگ یوں کہتے تھے کہ رسولؐ نے اُن سے موت پر بیعت لی اور جابر کہتے تھے کہ ہم سے بیعت نہیں لی مگر اس بات پر کہ ہم فرار نہیں کریں گے۔

اسی لئے قدیم ترین مؤرخ واقدی نے بطور اصل حقیقت اسی کو درج کیا ہے اور پہلے الفاظ کو قائل غیر معلوم کی طرف نسبت دے کر لکھا ہے اس طرح:-

فبايعهم على ان لا يفروا وقال قائل بايعهم على الموتؑ

حضرتؐ نے اُن سے بیعت لی اس پر کہ وہ فرار نہیں کریں گے اور کسی نے یوں کہا ہے کہ آپؐ نے اُن سے موت پر بیعت لی۔

اور متاخرین میں شاہ عبدالحق دہلوی نے اس دوسری

لہ تاریخ ابن الوردی ج ۱ ص ۱۲۵

۲ہ تاریخ ابو الفداء

۳ہ کتاب المغازی ج ۲ ص ۶۰۳

تعبیر سے صرف نظر ہی کر دیا اور پہلے ہی مضمون کو ذرا پُر تکلف عبادت میں تحریر کر دیا کہ :-

پشت مبارک بدرخت نہاد وصحابہ را بہ بیعت دلالت کرد کہ ثابت قدم باشند واگر جنگ واقع شود روئے نہ گردانند[1]

حضرتؐ نے پشت مبارک درخت سے لگائی اور صحابہ کو بیعت کی طرف رہنمائی فرمائی کہ ثابت قدم رہیں اور اگر جنگ ہو جائے تو منھ نہ پھرائیں۔

غور کیا جائے تو اُس تعبیر کا بھی کہ "موت پر بیعت لی" مطلب یہی ہوتا ہے کہ موت سے بھاگیں گے نہیں کیونکہ جان جانے کا امکان تو جہاد کے میدان میں آجانے سے لازماً پیدا ہی ہو جاتا ہے۔ اب "جان دینے کے لئے تیار رہیں" کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ میدان میں جانے کے بعد پھر جان بچانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اور وہاں جاکر جان بچانے کی کوشش کا مطلب فرار ہی ہو سکتا ہے۔ اور اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کہ تلوار آتی ہو تو سپر سے روکیں گے بھی نہیں یا وار پڑتا ہو تو اُسے خالی بھی نہ دیں گے۔ تو پھر جان دینے کے لئے تیار رہیں، کیا معنی؟ یہی کہ میدان سے فرار اختیار نہیں کریں گے۔

علامہ طبرسی تحریر فرماتے ہیں :-

نبایعوه تحت الشجرة على ان لا یفروا عنه ابداً[2]

ان سب نے درخت کے نیچے آپ سے بیعت کی اس بات پر کہ وہ آپ کو چھوڑ کر کبھی فرار نہیں کریں گے۔

---

[1] مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۲۸۲۔ [2] ص ۵۲ اعلام الوریٰ

اس "کبھی" کی لفظ میں بڑی اہمیت ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ عدم فرار کا عہد صرف اسی وقت کی جنگ سے جو وقوع ہی میں نہ آئی مخصوص نہ تھا بلکہ اس کے بعد بھی مدت العمر کسی بھی لڑائی سے فرار نہ ہونے کا عہد لیا جا رہا تھا۔

اب اگر بدنصیبی سے تاریخ حنینؔ میں پھر اُحد کا منظر پیش کردے جس کے لئے آئندہ کے صفحات کا انتظار کرنا پڑے گا تو ماننا پڑے گا کہ اس وقت کی بیعت پر بھی بیعت کرنے والے برقرار نہیں رہے اور اس کے بعد مرضات الٰہی کے وعدے کا جو اس بیعت کی بنا پر اللہ کی جانب سے ہوا ہے انجام معلوم ہے۔

مذکورہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے کہ ادھر سے جناب عثمان اس اطلاع کے ساتھ بھیجے گئے کہ ہم صرف خانۂ کعبہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں، ہمیں حج کرنا نہیں ہے اور اُن لوگوں نے جناب عثمان کو قید کر لیا جس پر یہاں یہ افواہ اُڑ گئی کہ وہ قتل کردیے گئے اور اب اس کے بعد مسلمان مرنے اور مارنے پر تیار ہوگئے، اب کتنے بے جوڑ ہیں۔ مسٹر کے۔ اے حمید کے یہ الفاظ کہ :-

"آخر حضرت عثمان کی وساطت سے اہل مکہ اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ لکھا گیا۔[1]"

---

[1] مسلمانانِ عالم ج ۱ ص ۸۱

جب وہ وہاں قید تھے، اُن کو پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آنے جانے اور کچھ گفتگو کرنے کا موقع ہی نہ تھا تو اُن کی "وساطت" کیونکر ہوئی اور اُس "وساطت" کے ذریعہ کوئی معاہدہ ہونے کا کیا امکان رہا بلکہ واقعہ یہ ہے جیسا کہ دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ اُنھوں نے اس بیعت کے واقعہ کے بعد خود اپنی طرف سے سہیل بن عمرو کو بھیجا اور اُس نے شرائط صلح طے کئے ہیں[1]

مؤرخین اکثر بیان واقعہ میں درمیانی کڑیاں چھوڑ دیتے ہیں اس لئے سہیل بن عمرو کے آنے کے بعد بس تحریر صلح نامہ کا حال لکھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ لازماً اس کے درمیان یہ کڑی ہے کہ اُس نے آکر پہلے زبانی مشرکین کا یہ پیغام سُنایا کہ آپ لڑنا نہیں چاہتے تو بلاوجہ لڑنا ہمیں بھی منظور نہیں ہے مگر اپنے جذبات کے لحاظ سے اپنی آنکھوں سے آپ کو مکہ میں داخل ہوتے اور آزادی کے ساتھ عبادت کرتے ہوئے دیکھ نہیں سکتے۔ یا جیسا کہ اُنھوں نے جناب عثمان کے پیغام پہونچانے پر کہا تھا کہ اس میں عرب میں ہماری سُبکی ہوگی اور لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ آپ طاقت کے بل پر ہمارے علی الرغم مکہ میں داخل ہوئے لہٰذا اس سال بغیر مراسم زیارت انجام دیے ہوئے واپس چلے جایئے اور ہمارے

[1] ابن الوردی ج ۱ صفحہ ۱۵۰ و ابو الفدا ج ۱ صفحہ ۱۳۶ وغیرہ

آپ کے درمیان ابھی سے قرار داد ہو جائے کہ آپ آئندہ سال آئیں گے اور مراسم عمرہ انجام دیں گے اس طرح کہ ہم تین دن کے لئے مکہ خالی کر دیں گے کہ آپ آزادی کے ساتھ اپنی عبادتیں جس طرح چاہیں انجام دے لیں۔

اُن کے پیش نظر اس میں یہ مقصد تھا کہ اس طرح پہلے سے یہ چرچا ہو گا کہ ہم نے خود انھیں ایک سال پہلے یہ اجازت دے دی تھی کہ وہ اس طرح مکہ میں آ کر اپنے رسوم ادا کریں۔ اس طرح اس سے ہماری کسی کمزوری کا ثبوت نہیں ہو گا۔

پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یقیناً زبانی گفتگو میں اس پر تیار ہونے کا اظہار فرما دیا ہو گا۔ پھر کتابت عہد نامہ کی نوبت آئی۔

غالباً اس زبانی گفتگو میں مشرکین نے یہ محسوس کر لیا کہ حضرتؐ کسی وجہ سے اس وقت جنگ کرنا نہیں چاہتے اور اس وقت جنگ ہو جانے کو وہ اپنے لئے نقصان رساں خیال فرماتے ہیں جس نکتہ کو بہت سے مسلمان اُس وقت تک نہیں سمجھ رہے تھے اور بعد میں بہت عرصہ تک نہ سمجھے اُسے پوری تفصیل کے ساتھ نہیں تو مجمل طور پر مشرکین کا نمائندہ سمجھ گیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جہادوں کی نوعیت بتاتے ہوئے جو ہم اس مسلمہ حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ ہمیشہ مشرکین چڑھائی کر کے آئے

اور رسولؐ خدا کو دفاعی حیثیت سے جنگ کرنا پڑی، جس پر پہلے حصہ میں کافی بسیط بحث آچکی ہے۔ یہ ہمارا دعویٰ بڑی حد تک مجروح ہو جاتا اگر اس وقت پیغمبر خداؐ جنگ کر کے فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوتے پھر یہ کہنے کو ہو جاتا کہ دیکھئے جب طاقت حاصل ہو گئی تو رسولؐ چڑھائی کر کے گئے اور دشمن پر حملہ آور ہوئے۔

مگر اس وقت جب کہ یہ موقع آنے لگا تو پیغمبر خداؐ نے ایسے شرائط پر صلح کر کے واپسی اختیار کی جنھیں عام مسلمان اپنے وقار کے خلاف تصور کر رہے تھے۔ اور اس واپسی کو اپنی شکست قرار دے رہے تھے مگر بعد میں آئے گا کہ خالق کریم نے اسے رسولؐ کی ایک بڑی کھلی ہوئی فتح قرار دیا۔

کم ظرف آدمی جب یہ سمجھ لیتا ہے کہ فریق مخالف کسی اپنے اصول کی بنا پر سہی اس وقت تلوار اُٹھانے کے لئے آمادہ نہیں ہے تو پھر اُس کی ہمت بڑھ جاتی ہے چنانچہ یہاں مشرکین کے نمایندہ نے یہ محسوس کر لیا تھا، اس کا ثبوت اُس کے رویہ سے ملتا ہے۔ اگر صورتِ حال یہ ہوتی کہ مسلمانوں کے جنگ پر جوش و خروش سے خوف زدہ ہو کر اُنھوں نے سہیل بن عمرو کو بھیجا تھا تو اس کا تقاضا یہ ہونا چاہیئے تھا کہ سہیل کی طرف سے عاجزانہ رویہ اختیار کیا جاتا اور اگر سمجھوتے میں اِدھر سے کوئی رکاوٹ پیدا بھی ہوتی تو وہ ایک

طرح کی پسپائی اختیار کر کے اُس رکاوٹ کو دُور کرتا مگر یہاں صورت حال اس کے برعکس نظر آتی ہے یعنی جب صلحنامہ کی کتابت شروع ہوتی ہے تو مشرکین کا نمائندہ ہر ہر قدم پر جھگڑا ڈالتا اور رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور پیغمبر خدا قدم قدم پر اُس کی ہر بات کو تسلیم کرتے ہوئے صلح کی کارروائی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

مسٹر کے۔ اے حمید جنھوں نے اس صلحنامہ کا سہرا بلا وجہ جناب عثمان کے سر باندھ دیا، صلحنامہ کا مسودہ لکھے جانے سے پہلے جیسے کسی ذریعہ سے اُس کے شرائط پر مطلع ہو گئے چنانچہ وہ رقم طراز ہیں کہ:-

"آخر حضرت عثمان کی وساطت سے اہل مکہ اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ لکھا گیا جس کی شرائط حسب ذیل تھیں:-

(۱) یہ عہدنامہ فریقین کے درمیان ایک سال تک قائم رہے گا۔ اس دوران ہر حاجی مکہ مدینہ میں بے خوف وخطر آجا سکتے ہیں۔

(۲) عرب کے جو قبائل قریش سے ملنا چاہیں بلاخوف اُن سے مل جائیں اور جو مسلمانوں سے ملنا چاہیں مسلمانوں سے مل جائیں۔ مسلمانوں سے ملنے والے قبائل کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔

(۳) آئندہ سال مسلمانوں کو حج کی اجازت ہوگی، مگر وہ ہتھیار لگا کر مکہ میں داخل نہ ہوسکیں گے۔

(۴) اگر قریش میں سے کوئی شخص مسلمان ہوکر مدینہ چلا جائے تو مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ اُسے فوراً واپس کردیں، اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص مرتد ہوکر قریش سے آملے تو قریش اُسے ہرگز واپس نہ کریں گے۔

آخری شرط پڑھ کر حضرت عمر فاروق بھڑک اُٹھے، مگر رسول اللہؐ نے سمجھا کر اُن کو تسلی دی اور قریش کی شرائط مان لی گئیں۔ معاہدہ کا مسودہ حضرت علیؑ لکھنے بیٹھے[۱]۔

اب یہ سوال بالکل کھلا ہوا ہے کہ جب بقول آپ کے حضرت عثمان کی وساطت سے معاہدہ لکھا جاچکا تھا تو اب حضرت علیؑ کیا چیز لکھنے بیٹھے؟ اس کے علاوہ آئندہ کے تفصیلات سے ظاہر ہوگا کہ حضرت عمر صرف آخری شرط پر نہیں بھڑکے تھے بلکہ وہ اُس پورے طریق کار یعنی اس موقع پر بغیر حج کئے ہوئے واپس جانے اور صلحنامہ کرنے سب ہی سے اختلاف رکھتے تھے اور وہ تحریر معاہدہ کے پہلے رسولؐ کے سمجھانے سے سمجھ بھی نہیں گئے تھے بلکہ معاہدہ لکھے جانے کے بعد بھی وہ اس کے مخالف رہے اور اُن کی ناراضگی اس سے برابر شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی رہی اور نہ صرف وہ بلکہ

---

[۱] تاریخ مسلمانان عالم ج ۱ ص ۸۱

مسلمانوں کی اکثریت اس سے ناراض تھی۔

اب اسے شوریٰ کو جزو دین کہنے والے اور اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کو سو فیصدی نظام جمہوری کا پابند بتانے والے حل کر سکتے ہیں کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مشرکین سے کسی سمجھوتے کے پہلے مجلس شوریٰ کیوں مرتب نہیں فرمائی اور پھر اکثریت کے خیالات کے ظاہر ہو جانے کے بعد اُس کی پیروی کیوں نہیں فرمائی؟

حدیبیہ میں تو صاف یہی نظر آتا ہے کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم منجانب اللہ بذاتِ خود اپنے کو صاحب اختیار جانتے ہیں اور عام مسلمانوں کی رائے کے خلاف اپنے فیصلہ پر قائم ہی نہیں رہتے بلکہ بتقاضائے ایمان و اسلام خود مسلمانوں کو اپنے فیصلے کے سامنے سر جھکا دینے پر مجبور فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے نہ مشرکین سے بات چیت میں کسی کو اپنے ساتھ شریک کیا اور نہ پھر اُن کے شرائط کے باب میں کسی سے کوئی رائے لی اور نہ اُن کی مخالفت کے ظاہر بظاہر ثبوت کے بعد اُس کی کوئی پرواہ کی بلکہ شروع سے آخر تک ہر قدم صرف اپنی صوابدید کے مطابق اُٹھایا جس کے پس پشت منشائے الٰہی کی تکمیل تھی جو خواہ بذریعہ وحی پہونچی ہو حالانکہ قرآن میں اس موقع کی کوئی آیت درج نہیں ہے جو طریق کار کے متعلق آپ کو کسی ہدایت کی حامل ہو اور خواہ یہ وہ وحی باطنی ہو جس کا سلسلہ برابر مرکز سے قائم رہتا تھا

جس میں فرشتے کا بھی کوئی دخل نہ تھا، چہ جائیکہ کوئی انسان۔

حدیبیہ کے معاملہ میں بہت نمایاں صورت یہ ہے کہ اس پوری کارروائی میں اُدھر سے مشرکین کا نمائندہ سہیل بن عمرو ہے اور ادھر سے صرف دو شخصیتیں منظر عمل میں ہیں۔ ایک خود رسول خداؐ جو اصل کار فرما ہیں اور دوسرے حضرت علی بن ابیطالب جن کے ہاتھ سے صلحنامہ لکھا جا رہا ہے۔ باقی تمام مسلمان اور اُن کے اہل الرائے افراد صرف تماشائی ہیں اور اپنی جگہ تلملا رہے ہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے اور ادھر سے ان کی جانب قطعاً اعتناء نہیں ہے کہ اُن کے چہروں کے رنگ کیا ہو رہے ہیں اور اُن کی آپس کی سرگوشیاں کیا ہیں اور اُن کے چشم و ابرو کے اشارے کیا ہو رہے ہیں۔؟

کیا اِس سے بڑھ کر مہمات دین میں جمہور کے جذبات کی بے وقعتی اور کچھ ہو سکتی ہے؟

اور اُدھر سے سہیل بن عمرو بھی یہ محسوس کر رہا ہے کہ پیغمبر اسلام اس وقت سب کچھ مان لینے پر تیار ہیں تو گویا جتنا دبا سکتے ہو دبا لو اور ممکن ہے اُس جہاں دیدہ مدبر کو مسلمانوں کے انداز سے بھی یہ نمایاں ہو رہا ہو کہ ان میں اس وقت بغاوت کے جراثیم حرکت میں ہیں تو اس وقت ان کے خون کو ذرا اور کھولا دیا جائے کہ شاید ان

ہیں ایسی پھوٹ پڑے اور ان کی جماعت کے آدمی ان سے خود ایسے برافروختہ ہوں کہ اُن میں خانہ جنگی ہو جائے اور اس طرح خود ان کے ہاتھوں ان کا مشن فیل ہو جائے۔ یہی سب محرکات ہو سکتے ہیں ورنہ عام حالات میں اُن کا جنگ کے لئے پہلے سے تیار نہ ہونا اور پیغمبر خداؐ کے ساتھ اُس جماعت کا ہونا جو اس کے پہلے ہر جنگ میں فتح حاصل کرتی رہی، اتنی تعداد میں جو اس کے پہلے شاید کسی غزوہ میں اکٹھا نہیں ہوئی ہے۔ اور پھر اس پوری جماعت کا ابھی ابھی دوبارہ آخر دم تک میدان میں ٹھہرنے یا دوسری لفظوں میں مرنے مارنے کا عہد کرنا، اس سب کے بعد اُسے ایسی جبارت کیونکہ ہو رہی تھی کہ وہ قدم قدم پر صلح کی آگے بڑھتی ہوئی کارروائی میں روڑے اٹکائے جس کے اظہار میں تمام مؤرخین متفق الکلمہ ہیں سب سے پہلے جب حضرت پیغمبر خداؐ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھوانا چاہا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تو اُدھر کا نمائندہ سہیل بن عمرو کہنے لگا، جناب! ہم اسے تو جانتے نہیں، وہ لکھئے جو ہمارے یہاں لکھا جاتا ہے۔ "باسمك اللّٰھم"

یاد رکھنا چاہیے کہ اگر وہ یہ کہتے کہ اس کے بجائے آپ لات وعزیٰ (اصنام) کے نام لکھئے تو یہ اصول کا سوال تھا۔ پھر سمجھوتہ ہونا غیر ممکن تھا مگر انھوں نے تو حقیقت میں صرف ایک نزاع لفظی سے کام لیا۔ اب یہ جذباتی اور پست ذہنیت والے افراد کا

کام ہوتا کہ صرف اپنی بات کو بالا رکھنے کے لئے اُن الفاظ پر اصرار کیا جاتا جو ادھرے پیش ہو رہے ہیں اور فریق مخالف کے الفاظ کو منظور نہ کیا جاتا مگر رسول خداؐ ایسی تنگ نظری سے بری تھے۔ آپ نے فرمایا "یہی لکھو جو سہیل کی خواہش ہے"۔

حقیقت میں یہ سہیل کی اپنے منصوبہ میں پہلی شکست تھی کہ رسولؐ اس بات پر نہ اُلجھے اور معاہدہ کی تحریر میں رکاوٹ پیدا نہ ہونے دی مگر جذباتی مسلمانوں کا اتنے پر خون کھول گیا کہ دیکھو رسولؐ نے ایک طرح اپنی ہار مان لی۔ اور اس کم بخت کافر کی بات کو اونچا ہو جانے دیا۔ مگر پھر شائد انھوں نے سمجھا ہو کہ خیر یہ ایک بات تھی۔ آگے تو پیغمبرؐ یقیناً مضبوطی دکھائیں گے مگر دوسری منزل آئی اور وہ اُس سے سخت۔

مسٹر کے، اے حمید کی لفظیں یہ ہیں کہ:۔

"معاہدہ کا مسودہ حضرت علیؑ لکھنے بیٹھے۔ مسلمانوں کے دستور کے موافق اُنھوں نے "اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے"۔ لکھنا شروع کیا۔ اس پر سہیل جو اہل مکہ کے سفیر تھے معترض ہوئے اور کہا ہم رحمٰن کے قائل ہی نہیں۔ اس لئے لفظ رحمٰن کاٹ دی جائے۔ سرکار نے جو مجسمۂ انسان تھے فوراً وہ لفظ کٹوا دیا اس کے بعد حضرت علیؑ نے لکھا کہ یہ عہد نامہ محمد رسول اللہؐ اور قریش کے درمیان لکھا گیا ہے۔ سہیل نے پھر اعتراض کیا کہ

ہم تو انھیں رسول مانتے ہی نہیں۔ اس پر مسلمان تڑپ اُٹھے مگر سرکارؐ نے کہا کوئی مضائقہ نہیں۔ بیشک رسول اللہؐ کا لفظ کاٹ دیا جائے[1]"

اس میں ابتدائی سطروں میں یہ جز غلط معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ نے دستور کے مطابق بطور خود بسم اللہ لکھنا شروع کیا بلکہ جیسا ہم نے اس سے پہلے لکھا ہے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم معاہدہ کا مضمون بول رہے تھے۔ آپ نے فرمایا "لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" اور اس پر سہیل بن عمرو بول دیا۔

تاریخ کے الفاظ یہ ہیں کہ:۔

دعا علیاً فقال اکتب بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم فقال سھیل ما اعرف ھٰذا ولکن اکتب بسمک اللّٰھم فقال صلے اللہ علیہ وسلم اکتب باسمک اللّٰھم[2]	آپ نے علیؑ کو بلایا اور کہا لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، سہیل نے کہا میں اسے نہیں پہچانتا بلکہ لکھو اپنے باسمک اللہ، اس پر حضرت نے فرمایا اچھا باسمک اللہ ہی لکھو۔

شرطیں بھی ایسی تھیں جن میں بظاہر مشرکین ہی زبردکھائی دے رہے تھے اور پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے دبتے چلے جاتے تھے

---

[1] تاریخ مسلمانانِ عالم ج ۱ ص ۸۱-۸۲

[2] تاریخ ابن الوردی ج ۱ ص ۱۴۵ ابوالفدا ج ۱ ص ۱۳۶

اس سال بغیر زیارت کعبہ کئے ہوئے واپس چلے جائیے آئندہ سال صرف تین دن کے لئے آئیے گا۔ اس دوران میں جو یہاں سے بھاگ کر آپ کے پاس جائے آپ کو واپس کرنا ہوگا اور جو آپ کے پاس سے بھاگ کر ادھر آئے گا اُسے واپس نہیں کیا جائے گا۔[1]

ان میں سے ہر شرط وہ ہے جس کے رکھنے کی ہمت ایک ایسی قوم کے نمائندہ کو ہو ہی نہیں سکتی تھی جو ہر منزل پر شکست کھا چکی ہو مگر جیسا کہ پہلے ہی خیال ظاہر کیا جا چکا ہے، اس وقت اپنی پختہ کار سیاسی نظر سے اُدھر کے نمائندہ نے یہ تاڑ لیا تھا کہ پیغمبر اس وقت جنگ کرنے پر کسی نہ کسی وجہ سے آمادہ نہیں ہیں اس لئے وہ سمجھا کہ جتنا دبایا جا سکتا ہو اتنا دبا لیا جائے۔ اور اُس کا یہ اندازہ صحیح تھا کہ آپ جنگ اس وقت کسی قیمت پر بھی کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے آپ دبتے چلے گئے۔ مگر ایسا دبنا جس کے نتیجہ میں وہ کامیابی تھی جس کے لحاظ سے خالق نے بدر، اُحد، خندق اور خیبر کے جنگی فتوحات کو "فتح مبین" نہ کہا اور جب ان شرائط پر صلح کر کے واپس تشریف لئے جا رہے ہیں تو خالق کا اعلان پہونچ رہا ہے کہ

انا فتحنا لک فتحا مبینا	ہم نے آپ کو بڑی کھلی ہوئی فتح عطا کی

---

[1] تاریخ ابن خلدون طبع بیروت ج ۲ ص ۷۸۵

افسوس ہے کہ مشرکین کا نمائندہ جس راز کو کسی حد تک سمجھ گیا
تھا کہ پیغمبرؐ اس وقت جنگ ہو جانے کو اپنے کسی اصول کی شکست
سمجھ رہے ہیں اسے بہت سے مسلمان اُس وقت نہ سمجھ سکے اور نہ سمجھنے
کے بعد بھی رسولؐ کی صحت فیصلہ پر اعتماد کامل جو ایمان کا تقاضا
ہے اگر ذہن و دماغ پر حاوی رہتا تو بھی صرف فکر و حیرت کا محل
ہو سکتا تھا لیکن اعتراض و اختلاف اور شک و تذبذب کی شکل
پیدا ہونا منطقی حیثیت سے قطعاً غیر ممکن تھی مگر صد حیف کہ
جذبات کی شدت نے ایمان کے تقاضوں کو مغلوب کر لیا جسے
تاریخ نے یوں لکھا ہے کہ

دخلهم من ذلک امر عظیم حتی کادوا یهلکون[1] | لوگوں کے دلوں میں اس سے امر عظیم پیدا ہوا یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ ہلاکت میں مبتلا ہو جائیں

اور پھر ان سب تاریخوں ہی نے نہیں بلکہ صحاح حدیث نے بھی
اس ابہام کے پردہ کو چاک کر کے اس میں پیش پیش نظر آنے والی شخصیت
کا نام بھی دے دیا ہے چنانچہ صحیح بخاری ج ۲ صفحہ ۱۸۲ کتاب الجہاد میں ہے:۔

فجاء عمر بن الخطاب فقال یا رسول اللہ السنا علی الحق وھم علی الباطل فقال بلی فقال الیس قتلانا | عمر بن خطاب نے آکر کہا یا رسول اللہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں اور وہ باطل پر نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں کہا کیا ہمارے مقتول بہشت میں

---

[1] الکامل ابن الاثیر الجزری ج ۲ صفحہ ۸۲

فی الجنۃ وقتلاھم فی النار قال بلٰی قال فعلٰی ما تعطی الدنیۃ فی دیننا انرجع ولما یحکم اللہ بیننا و بینھم فقال یا ابن الخطاب انی رسول اللہ و لن یضیعنی ابدا فانطلق عمر الی ابی بکر فقال لہ مثل ما قال النبیؐ فقال انہ رسول اللہ و لن یضیعہ اللہ ابدا فنزلت سورۃ الفتح فقرأھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم علٰی عمر الی اخرھا فقال عمر یا رسول اللہ او فتح ھو قال نعم۔

اور ان کے مقتول دوزخ میں نہیں ہوں گے؟ فرمایا کیوں نہیں۔ کہا تو پھر ہم کیوں اپنے دین میں اس ذلت کو برداشت کریں؟ کیا ہم واپس جائیں درصورتیکہ اللہ نے ہمارے اور انکے درمیان کوئی فیصلہ کن صورت پیدا نہیں کی ہے۔ حضرت نے فرمایا اے پسر خطاب میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور اللہ مجھے کبھی نظر انداز نہیں کریگا۔ یہ سن کر عمر ابوبکر کے پاس گئے اور وہی باتیں کہیں جو رسول خداؐ سے کہی تھیں۔ انھوں نے بھی کہا کہ وہ اللہ کے رسولؐ ہیں اور اللہ انھیں کبھی نظر انداز نہیں کریگا۔ پھر سورۂ انا فتحنا نازل ہوا تو رسول خداؐ نے وہ سورہ شروع سے آخر تک حضرت عمر کو سنایا تو انھوں نے کہا، اچھا تو وہ کیا کوئی فتح ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔

مؤرخ دیار بکری لکھتے ہیں:۔

عن عمر انہ قال واللہ

عمر کہتے ہیں کہ بخدا جب سے میں نے

ما شككت منذ اسلمت
الا يومئذ فاتيت النبي
فقلت الست نبي الله حقاً
قال بلى قلت السنا
على الحق وعدونا على
الباطل قال بلى قلت
اليس قتلانا في الجنة
وقتلاهم في النار قال
بلى قلت فلم نعطي الدنية
في ديننا قال اني رسول الله
ولست اعصيه وهو ناصري
قلت اولست كنت تحدثنا
انا سنأتي البيت فنطوف
به قال بلى انا خبرتك
انا نأتيه العام قلت لا
قال فانك آتيه ومطوف
به قال فاتيت ابا بكر
فقلت يا ابا بكر اليس
هذا نبي الله حقاً قال

اسلام قبول کیا مجھے کبھی شک پیدا
نہیں ہوا سوا اس دن کے تو میں نے پیغمبر
کے پاس آکر کہا کہ کیا آپ اللہ کے سچے
پیغمبر نہیں ہیں؟ انھوں نے کہا کیوں نہیں
میں نے کہا کہ کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن
باطل پر نہیں ہے؟ کہا کیوں نہیں، میں نے کہا کیا
یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہمارے مقتول بہشت میں
ہوں گے اور انکے مقتول دوزخ میں ہیں؟ فرمایا
کیوں نہیں، میں نے کہا پھر ہم اپنے دین میں اس
ذلت کو کیوں قبول کریں؟ آپ نے فرمایا میں اللہ
کا پیغمبر ہوں اور میں اسکی نافرمانی نہیں کر سکتا
اور وہ میرا مددگار ہے۔ میں نے کہا کہ آپ ہم سے
یہ باتیں نہیں کہتے تھے کہ ہم عنقریب خانۂ کعبہ میں
داخل ہو کر اسکا طواف کریں گے؟ کہا کیوں نہیں
مگر کیا میں نے تمھیں یہ بھی خبر دی تھی کہ یہ اسی سال
ہوگا میں نے کہا نہیں، فرمایا تو (میں پھر کہتا
ہوں) کہ تم وہاں پہونچو گے اور طواف کروگے
وہ کہتے ہیں کہ پھر میں ابوبکر کے پاس گیا،
میں نے کہا اے ابوبکر کیا یہ سچے رسول نہیں
ہیں؟ انھوں نے کہا

بلٰی قلت فلم نعطی الدنیا فی دیننا قال انھا الرجل انہ رسول اللہ ولن یعصیہ فاستمسک بغرزہ فو اللہ انہ لعلی الحق المبین[۵۱]

کیوں نہیں، میں نے کہا تو پھر ہم اپنے دین میں اس ذلت کو کیوں برداشت کریں؟ اُنھوں نے کہا اے مردک! وہ بلاشبہ اللہ کے پیغمبر ہیں اور وہ اُس کی ہرگز نافرمانی نہیں کریں گے تو تم اُن کا دامن تھامے رہو کہ وہ یقیناً کھلے ہوئے حق پر ہیں۔

شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی اس پورے واقعہ کو فارسی زبان میں درج کیا ہے اس طرح کہ :-

"نقل است از عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کہ گفت در آمد دراں روز در دل من امر عظیم و مراجعت کردم با حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کہ ہرگز مثل آں نہ کردہ بودم و رفتم نزد رسول و گفتم آیا تو پیغمبر حق نیستی؟ فرمود بلے ہستم۔ گفتم نہ ما بر حقیم و مخالفان ما بر باطل گفت بلے۔ گفتم پس چرا ما دایں ذلت و حقارت کشیم و ایں طور صلح نمودہ باز گردیم۔ آنحضرت فرمود اے پسر خطاب بدرستے کہ من فرستادۂ خدایم و بے فرمان وے نمی کنم و وے ناصر و معین من است و مرا ضائع نخواہد گزاشت گفت عمر پس ہم چناں حزیں واندوہ گیں از پیش آنحضرت برخاستم و بنزد ابوبکر صدیق رفتم ہماں حکایت کہ بعرض حضرت رسانیدہ بودم بارے نیز گفتم و ہماں جواب کہ آنحضرت گفتہ بود از ابوبکر نیز شنیدم[۵۲]"

---

۵۱ تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۲ — ۵۲ مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۲۸۶-۲۸۷

مگر جیسا کہ پہلے درج ہو چکا حضرت عمر اپنی اس رائے اور اپنے ان جذبات میں منفرد نہ تھے بلکہ واقعہ یہ تھا جس کے بعض شواہد بعد میں درج ہوں گے کہ مسلمانوں کی اکثریت یا رائے عامہ اُن کے موافق تھی چنانچہ ابن اثیر کے علاوہ جن کے الفاظ پہلے درج ہو چکے ہیں۔ دوسرے مورخین نے بھی صاف اس وقت کی کیفیت کو تمام صحابہ کی طرف منسوب کرکے لکھا ہے :-

کان اصحاب رسول اللّٰہ یکرھون الصلح لانھم خرجوا لایشکون فی الفتح لرؤیا رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم انہ حلق رأسہ وانہ دخل البیت فاخذ مفتاح الکعبۃ وعرّف مع المعرّفین فلمّا رأوا الصلح دخل الناس من ذلک امر عظیم حتے کادوا یھلکون[۱]۔

اصحاب پیغمبر خدا صلح کو ناپسند کرتے تھے اس لئے کہ وہ جو نکلے تھے تو کوئی شک اُنھیں فتح میں بھی نہ تھا۔ حضرت پیغمبر خدا کے اس خواب کی وجہ سے کہ آپ نے اپنا سر منڈوایا ہے اور آپ کعبہ میں داخل ہو کر کعبہ کی کنجی پر قبضہ کیا ہے اور عرفات جانے والوں کے ساتھ عرفات گئے ہیں تو جب اُنھوں نے صلح ہوتے دیکھی تو تمام لوگوں کے دلوں میں عظیم شک و شبہہ کی کیفیت پیدا ہوئی یہاں تک کہ قریب تھا جب ہلاکت میں پڑ جائیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عمر جو کہہ رہے تھے اُس میں مسلمانوں کی

---

[۱] المغازی للواقدی ج ۲ ص ۶۰۷

اکثریت اُن کے ساتھ شریک تھی مگر پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اس طرح یہ حقیقت پوری شدت اور قوت سے سامنے آگئی کہ پیغمبر خدا اپنے فیصلہ اور عمل میں قطعاً کسی شوریٰ یا رائے جمہور کے پابند نہ تھے۔

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اہل حل و عقد کا خیال اور جمہور کا فیصلہ غلطی پر تھا۔ اور رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہی صحیح تھا اور اسلامی ترقی کے لئے بیش از بیش فوائد کا حامل تھا جس کا احساس پھر بعد میں اُن حضرات کو بھی ہو گیا اور حضرت عمر کا آخر عمر کا جو بیان ہے اُسے شاہ عبدالحق نے یوں درج کیا ہے:-

گفت وے رضی اللہ عنہ عمرے است کہ از وسوسۂ شیطان و کید نفس کہ دراں روز در خاطر من گزشتہ بود استغفار می کنم و باعمال صالحہ از صوم و صلوٰۃ و انفاق و تصدقات توسل می جویم تا کفارت آں برائت من گردد[1]

آپ نے کہا کہ ایک بڑی مدت عمر کی گزری ہے کہ میں شیطان کے وسوسے اور نفس کی دسیسہ کاری سے جو اس دن میرے ذہن پر غالب ہوئی تھی مغفرت کا طلبگار اور نیک اعمال کے ساتھ جیسے نماز، روزہ، خیرات اس کے کفارہ کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ میں اس گناہ سے چھٹکارا پاؤں۔

---

[1] مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۲۸۷

اور تاریخوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔[۱]

بہرحال یہ اعتراف خطا اور کفارے چاہے بعد میں مواخذہ اخروی سے بچا لیں مگر یہ حقیقت تو بہرحال اس سے ثابت ہو جاتی ہے کہ حق ہمیشہ جماعت کے ساتھ نہیں ہوا کرتا یعنی حق تابع جمہور نہیں ہے جمہور کو تابع حق ہونا چاہیئے۔

لفظی ہی طور پر صلحنامہ کے شرائط مسلمانوں کے مزاج کو برہم کیے ہوئے تھے کہ فوراً ہی عملی حیثیت سے صبر آزما مرحلہ اُن کے نفاذ کا آگیا ایسا جو جذبات ہمدردی کو حرکت میں لانے کی بنا پر سخت ترین امتحان کی حیثیت رکھتا تھا۔ یعنی ابھی معاہدہ کی روشنائی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ اُسی سہیل بن عمرو کا جس نے اس صلحنامہ میں مشرکین کی نمایندگی کی تھی لڑکا ابو جندل جو مسلمان ہو چکا تھا اور اس جرم کی سزا میں ماں باپ اور دیگر گھر والوں نے اسے پا بہ زنجیر کر کے قید کر رکھا تھا۔ اب یہ خبر سن کر کہ رسولؐ مکہ کے پاس پہونچ گئے ہیں، کسی طرح نکل کر اُسی لوہے میں جکڑے ہونے کی حالت میں افتاں و خیزاں بڑی اُمیدوں کے ساتھ رسولؐ کے پاس پہونچ گیا اور اپنے کو آپ کے قدموں پر ڈال دیا اور سمجھا کہ بس مجھے گوشہ نجات اور گہوارہ عافیت مل گیا مگر یہاں رسولؐ اُسی سہیل بن عمرو کے ساتھ یہ معاہدہ فرما چکے تھے کہ جو اُدھر سے

---

[۱] تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۲

بھاگ کر آئے گا واپس کیا جائے گا۔ سہیل نے اُس معاہدہ کی بنا پر کہا کہ میں تو اسے واپس لے جاؤں گا۔

علامہ طبرسی نے اس موقع کا بیان بڑے ہلکے الفاظ میں کیا ہے مگر وہ بھی اس موقع پر مسلمانوں کے جذبات اور رسولؐ کے تاثرات اور پھر آپ کے عمل کے متعلق ہیں اور ہر پڑھنے والے کو بہت کچھ سمجھانے کے لئے کافی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

فجاء ابو جندل الی النبی صلے اللہ علیہ واٰلہ حتے جلس الی جنبہ فقال ابوہ سہیل ردہ علیّ فقال المسلمون لا نردہ فقال علیہ السلام بیدہ فاخذ بیدہ فقال صلے اللہ علیہ واٰلہ اللّٰھم ان کنت تعلم ان ابا جندل لصادق فاجعل لہ فرجا و مخرجا ثم اقبل علے الناس وقال انہ لیس علیہ باس وانما یرجع الی ابیہ وامہ وانی

ابو جندل حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آیا یہاں تک کہ آپ کے پہلو میں بیٹھ گیا تو اُس کے باپ سہیل نے کہا کہ اسے مجھے واپس کیجئے مسلمانوں نے کہا ہم اسے نہیں واپس کرینگے حضرتؐ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا جس پر اُس نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ حضرتؐ نے (بارگاہ الٰہی میں) عرض کیا کہ خداوندا اگر تیرے علم میں ابو جندل سچا ہے تو اس کے لئے کشائش پیدا کر۔ پھر آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، فرمایا اُس کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ اپنے باپ ماں ہی کے پاس تو جا رہا ہے

وأريد أن أتم لقريش شرطها[1]

اور مجھے منظور ہے کہ قریش سے جو شرط ہوگئی ہے اُسے پورا کروں۔

علامہ ابن اثیر نے مسلمانوں کی عام حالت کے پس منظر میں جو اس وقت تھی اس واقعہ کو زیادہ مؤثر انداز میں لکھا ہے:-

بينا النبي يكتب الكتاب إذ جاء أبو جندل بن سهيل بن عمرو يرسف في الحديد قد انفلت إلى رسول الله فلما رأى سهيل ابنه أبا جندل أخذه وقال يا محمد قد تمت القضية بيني وبينك قبل أن يأتيك هذا قال صدقت فأخذه ليرده إلى قريش فصاح أبو جندل يا معشر المسلمين أرد إلى المشركين ليفتنوني عن ديني فزاد الناس شرا إلى

اس دوران میں جب کہ پیغمبر خدا نے یہ دستاویز تحریر فرمائی تھی کہ ایک دم سہیل بن عمرو کا لڑکا ابوجندل لوہے میں جکڑا ہوا آگیا جو موقع پاکر وہاں سے بھاگ کر رسول خدا کی پناہ میں آیا تھا جب سہیل نے اپنے بیٹے ابوجندل کو دیکھا تو اُسے پکڑ لیا اور کہا اے محمد! مجھ میں اور آپ میں اس کے آنے کے پہلے تصفیہ ہو چکا ہے۔ آپ نے فرمایا ٹھیک کہتے ہو چنانچہ وہ اُسے پکڑ کر قریش کی طرف واپس لے چلا۔ اب ابوجندل نے چیخ کر کہا اے گروہ اہل اسلام! مجھے مشرکین کی طرف پلٹایا جارہا ہے کہ وہ مجھے میرے دین سے برگشتہ کریں۔ اس پر جو مسلمانوں

---

[1] اعلام الورى

ما بهم فقال له رسول الله ﷺ
احتسب فان الله جاعل
لك ولمن معك من
المستضعفين فرجا ومخرجا
انا قد اعطينا القوم عهود
نا على ذلك فلا نغدر
بهم[1]

کی حالت تھی وہ اور زیادہ خسر
ہو گئی۔ رسول ﷺ نے فرمایا صبر کرو کہ ا
تمھارے لئے اور تمھارے ساتھ کے دو
کمزور مسلمانوں کے لئے کشائش اور نکل
ذریعہ کچھ قرار دے گا۔ ہم نے ان لوگوں
ساتھ اس بارے میں کچھ معاہدے کر لئے
اسلئے ہم عہد شکنی سے مجبور ہیں۔

حضرت عمر جو اس فیصلہ کی صحت کو اب تک قبول نہ کر سکے
اس کے درپے تھے کہ عملی طور پر یہ فیصلہ درہم وبرہم ہو جائے چنانچہ
یہ موقع انھیں غنیمت معلوم ہوا۔

دیار بکری کا بیان ہے :-

فوثب عمر بن الخطاب
يمشي الى جنب ابي جندل
ويقول اصبر يا ابا جندل
فانما هم المشركون وانما
دم احدهم كدم كلب و
يدني عمر قائم السيف
منه يقول رجوت ان

جناب عمر بن خطاب نے اپنی جگہ سے چھلانگ
لگائی اور ابو جندل کے ساتھ ساتھ چلنے
لگے اور کہہ رہے تھے کہ اے ابو جندل ثابت
قدم رہو کہ یہ لوگ تو مشرک ہیں اور ان میں
ایک کا خون تو بس مثل کتے کے خون کے
اور عمر تلوار کے قبضہ کو اس کے قریب کر
تھے وہ کہتے ہیں کہ مجھے امید تھی کہ

---

[1] کامل ج ۲ ص ۸۲

یأخذ السیف فیضرب بہ اباہ فضن الرجل بابیہ (فی روایۃ قال ابوجندل یا عمر ما انت باحری بطاعۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منی[1]

تلوار ہاتھ میں لے لے گا اور اُسے اپنے باپ پر چلا دے گا مگر اُس شخص نے اپنے باپ کی زندگی کو عزیز کیا۔ اور ایک راوی کے بیان میں ہے کہ ابوجندل نے کہا اے عمر! تم سے کم مجھے پیغمبر خدا کی اطاعت کا حق نہیں ہے۔

مسٹر کے، اے حمید نے لکھا ہے:

"عہد نامہ کی تکمیل کے بعد ابھی رسول اللہؐ حدیبیہ ہی میں مقیم تھے کہ اسی اہل مکہ رات کے وقت مسلمانوں کو قتل کرنے کے ارادے سے اُن کے لشکر میں آگھسے جو سب کے سب گرفتار کر لئے گئے لیکن ان مجسم رحم نے معاف کر کے ان سب کو چھوڑ دیا اور خود سب مسلمانوں کو ساتھ لے کر مدینہ لوٹ گئے[2]"

جہاں تک میری نظر ہے مستند تاریخیں اس ذکر سے خالی ہیں میں سمجھتا ہوں یہ گفتگوئے صلح کے قبل حضرت کے قریب مکہ پہونچنے کے فوراً بعد ہی کا واقعہ ہے جس کا ذکر خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری نے اس طرح کیا ہے:-

"قریش کے چند سر پھرے نوجوان آنحضرتؐ پر حملہ کرنے

---

[1] تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۲ [2] تاریخ مسلمانان عالم ج ۱ ص ۸۲

کے لیے آ گئے جنھیں گرفتار کرکے سرکار رسالت کے حضور میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس اقدام سے درگزر فرمایا اور انھیں رہا کر دیا۔"[1]

واپسی کے موقع پر مسلمانوں کی برہمی جو اس صلح سے تھی، اُس کا اثر پورے جاہ و جلال سے نمایاں تھا چنانچہ جب پیغمبر خدا نے معاہدہ کی تکمیل کے بعد اصحاب سے فرمایا کہ اُٹھو، قربانیاں کرو اور سروں کے بال منڈوا کر واپس چلو۔ تو عالم یہ تھا کہ رسول نے تین دفعہ حکم دیا اور مجمع کی اکثریت خاموش رہی۔ تقریباً کوئی تعمیل کے لیے نہ اُٹھا۔ آخر جب حضرت نے اُن کی طرف سے بے اعتنائی اختیار کرکے خود جا کر قربانی کی اور بال منڈوائے تو مجبوراً دوسرے لوگ بھی کھڑے ہوئے اور کچھ نے بال منڈوائے اور اکثر نے بددلی سے تھوڑے تھوڑے ترشوائے اور رنج و صدمہ کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن میں سے ایک دوسرے کو قتل کر رہا ہے۔[2]

تاریخ ابن الوردی میں ہے کہ پیغمبر خدا نے مدینہ کی جانب مراجعت کی اور اختتام سال تک وہاں قیام فرمایا یہاں تک کہ سنہ ۷ھ شروع ہوا۔[3]

---

[1] اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ ج ۱ ص ۱۸۵ [2] طبری ج ۲ طبع جدید مصر ص ۶۳۷ [3] ابن الوردی ج ۱ ص ۱۲۶

صلح حدیبیہ کے اثرات :-

اُس وقت مسلمان نادانی سے جس صلح پر انتہائی افسردہ بلکہ ناراض تھے، تھوڑے ہی عرصہ میں اُن سب کی آنکھوں کے سامنے اس صلح کے خوشگوار نتائج آفتاب نصف النہار کی طرح سامنے آ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ کی ناخوشگوار فضا اکثر صبر و سکون کے ساتھ حقیقتوں پر غور کرنے میں سدِّ راہ ہوتی ہے۔ اور نفرت کی شدت راہ جستجو میں پہاڑ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اب اس صلح کی بدولت جو فضا میں سکون ہوا تو بہت سے لوگوں کو قریب سے رسول خداؐ کے اخلاق دیکھنے کا موقع ملا۔ اسلام کی ترقی کے اسباب پر غور کرنا پڑا۔ باوجود انتہائی مزاحمتوں کے نورِ حق پھیلنے کا احساس کرنے کی توفیق ہوئی۔

اس کے علاوہ جیسا خواجہ محمد لطیف صاحب نے لکھا ہے:-

"جو مسلمان مشرکین کے پاس چلے جاتے تھے اور اُنھیں چوتھی شرط کے مطابق واپس نہیں کیا جاتا تھا وہ وہاں اپنی زبان سے بھی اور اپنے عادات و اخلاق سے بھی مستقل طور پر نشر و اشاعت اسلام کا ذریعہ تھے۔ جو مکہ والے چند روز مسلمانوں میں رہ کر واپس ہوتے تھے وہ مسلمانوں کے حسنِ سلوک اور اوضاع و اطوار کو بیان کر کے تبلیغ کے فریضہ کو انجام دیتے

تھے۔[۱]"

نتیجہ یہ ہوا کہ اس ایک سال کی مدت میں مسلمانوں کی مردم شماری میں وہ اضافہ ہوا جو اس پوری مدت میں ابھی تک کبھی نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق کا قول ہے کہ :-

لم تنقض هذه المدة حتى كاد الاسلام يستولى على اهل مكة[۲]۔

یہ مدت گزرنے نہیں پائی یہاں تک کہ اسلام قریب تھا کہ تمام اہل مکہ پر چھا جائے۔

مسٹر کے، اے حمید لکھتے ہیں :-

"یہ وہ زمانہ تھا جب بڑے بڑے سردار اسلام میں جوق در جوق داخل ہو رہے تھے۔ دنیا کے مشہور و معروف جرنیل خالد بن ولید نے اسلام قبول کیا مشرف با سلام ہوئے۔[۳]"

۱؎ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ ج ا ص۱۲۹ ۲؎ اعلام الوریٰ

۳؎ مسلمانانِ عالم حصہ اول ص۲۵

غزوۂ خیبر

سنہ ۷ھ کے آغاز کے ساتھ اسلام کی یہ مہتم بالشان مہم سر ہوئی جس کے بعد یہود کی طاقت جزیرۃ العرب میں بالکل ختم ہو گئی۔

بعض تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم وسط محرم میں غزوۂ خیبر کے لیے نکلے[1] ایک قول یہ ہے کہ جمادی الاول میں یہ مہم در پیش ہوئی[2] اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ سنہ ۶ھ کے ذی الحجہ ہی کا واقعہ ہے[3]

علامہ سید محسن امین عاملی لکھتے ہیں کہ خیبر مدینے کے ساتھ برید مسافت پر تقریباً ۴۸ گھنٹے کی راہ تھا۔ اس کا یہ نام عمالقہ میں سے ایک شخص کے نام پر ہوا جس نے یہاں قیام کیا اور اس کے بھائی یثرب کے نام پر مدینہ کا نام ہوا اور دوسرا قول یہ ہے کہ خیبر کے معنی یہود کی زبان میں قلعہ کے ہیں اور یہ ایک بڑا شہر تھا جس میں بڑے مضبوط قلعے تھے اور کھیتیاں اور نخلستان تھے[4]

اسی دوسرے قول کے مطابق خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری لکھتے ہیں کہ :-

---

۱ تاریخ ابو الفداء ج ۱ ص ۱۴۷

۲ اعلام الوریٰ

۳ اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۲۵۶

۴ اعیان الشیعہ ج ص ۲۵۶

"خیبر عبرانی لفظ ہے جس کا ماخذ لفظ خبر ہے جو قلعوں کے معنی میں ہے۔ خیبر مدینہ منورہ سے جانب شمال آٹھ منزل یعنی ۹۲ میل کے فاصلہ پر یہودیوں کا ایک قصبہ تھا جہاں بہت سے قلعے تھے۔ اسی قصبہ کے نام پر اس کے متعلق یہودی نوآبادی کا نام خیبر تھا۔ یہ نوآباد ایک نخلستان ہے۔ یورپ کا سیاح مسٹر ڈاوٹی (Doutey) جس نے ۱۸۷۷ء میں عرب کی سیاحت کی ہے مہینوں خیبر میں رہا ہے۔ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے "نخلستانِ خیبر کی زمین زرخیز ہے۔ قوم یہود کے یہاں بڑے بڑے مضبوط اور مستحکم قلعے بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے چند قلعوں کے آثار اب تک باقی ہیں اور قائم ہیں[1]"

خیبر پر حملے کا پس منظر اور اُس کی نوعیت :۔

مسٹر کے۔ اے حمید بی۔ اے (لنڈن) بیرسٹرایٹ لا لاہور لکھتے ہیں :۔

"خیبر مدینہ سے شام کی طرف تین منزل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں یہودیوں کی کئی ایک بستیاں قائم تھیں۔ یہودیوں کو خیبر کے فلک بوس قلعوں پر بہت ناز تھا۔ انھیں یقین تھا کہ ان کا ملک بہت زیادہ مستحکم اور مضبوط ہے۔ وہ غزوۂ خندق کی شکست سے بہت پشیمان تھے اور دن رات اپنے ماتھے

---

[1] اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول صفحہ ۱۵۰ - ۱۵۱

یہ کلنگ کا ٹیکا اُتارنے کی فکر میں رہتے تھے۔ انھوں نے کئی قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر اُن سے خفیہ معاہدہ کیا کہ اگر وہ مدینہ فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمیشہ کے لیے خیبر کی نصف پیداوار اپنے حلیفوں کو دیا کریں گے۔ مسلمانوں کو اس حملے کی تیاری کا پتہ چلا تو اُنھوں نے مجلس مشاورت قائم کر کے طے کیا کہ مدینہ کے باہر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔[1]

اس میں اصل حقیقت کی بہت ہلکی جھلکیاں موجود ہیں "وہ غزوۂ خندق کی شکست سے بہت پشیمان ہوئے" اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس جماعت نے غزوۂ خندق میں مشرکین کا ساتھ دیا تھا اور انھیں جو شکست ہوئی تھی اُس شکست میں یہ بھی شریک تھے۔ اب یہ سابق کے واقعات سے جو تاریخ کے صفحات پر درج ہو چکے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ مشرکین کا ساتھ دینے والے کوئی اور نہ تھے۔ وہی مدینہ کے باشندہ قبائل تھے جنھوں نے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت کو سیاسی طور قبول کیا تھا یعنی اُنھوں نے اقتدار اسلامی کے زیر سایہ بحیثیت رعایا رہنا تسلیم کیا تھا۔ انہی قبائل میں سے جنھوں نے اس معاہدہ کے بعد مختلف اوقات میں مشرکین کے ساتھ ساز باز کیا کچھ جلاوطن کیے گئے، وہ خیبر گئے اور کچھ بھاگ کر گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی بیرونی جماعت نہ تھی جس سے

---

[1] تاریخ مسلمانان عالم حصۂ اول ص۵۳

مقابلہ کو بین الاقوامی موجودہ اصطلاحات کے رو سے "جنگ" کے نام سے تعبیر کیا جائے بلکہ یہ اپنے ہی قلمروِ حکومت کے اندر کے وہ افراد تھے جو وفاداری کے تقاضوں پر پورے نہیں اُترے اور اُنھوں نے مخالف جماعتوں کے ساتھ ساز باز کیا اور اب اُن کی نوبت یہ پہونچی کہ اُنھوں نے کئی قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر اُن سے خفیہ معاہدہ کیا کہ اگر وہ مدینہ فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمیشہ کے لئے خیبر کی نصف پیداوار اپنے حلیفوں کو دیا کریں گے"۔

تو اب ان کے خلاف جو "مہم" وقوع میں آئے اُسے "تادیبی مہم" کی حیثیت حاصل ہو گی جسے موجودہ زمانہ میں "پولیس ایکشن" کہتے ہیں جس پر پہلے بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے اور اس جگہ پھر اس کو واضح کرنا ضروری سمجھا گیا کیونکہ یہ حقیقت اکثر نگاہوں سے اوجھل ہے جس کی وجہ سے جب اس حقیقت کا اظہار کیا جاتا ہے کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام لڑائیاں دفاعی حیثیت رکھتی تھیں کبھی آپ نے خود مخالف طاقت پر حملہ نہیں کیا تو اعتراض کے طور پر خیبر کی مہم کو پیش کیا جاتا ہے کہ یہاں یہودیوں پر تو خود رسول نے حملہ کیا تھا مگر یہ خیال بالکل غلط ہے۔ وہ کسی مخالف جماعت کے مرکز پر حملہ نہ تھا بلکہ اندرونِ ملک کے امن کو قائم رکھنے کی ایک کارروائی تھی جو ہر منظم حکومت کا ایک لازمی فریضہ ہے

فوج اسلام کی روانگی اور محاذ جنگ

مسٹر کے۔ اے حمید لکھتے ہیں:۔

"چودہ سو مسلمان جن میں بیس خواتین تھیں اپنے گھروں کے بچاؤ کی خاطر مدینہ سے باہر نکلے اور منزل بمنزل خیبر کے قریب پہونچ گئے اور میدان میں خیمے نصب کر دیئے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ جب بنی غطفان یہودیوں کی امداد کے لیے نکلے تو مسلمانوں کو دیکھ کر واپس لوٹ گئے۔ جہاں مسلمانوں نے خیمے نصب کیے تھے وہی جگہ سرکار نے لڑائی کے لیے منتخب کی۔ خیموں کے ارد گرد یہودیوں کے دس عظیم الشان قلعے تھے جن میں دس ہزار فوج ہر وقت لڑنے کے لیے تیار رہتی تھی۔"[1]

علامہ طبرسی نے لکھا ہے کہ خیبر میں چودہ ہزار یہودی قلعہ بند تھے۔[2]

نبیؐ و علیؑ دونوں کی علالت

خالق کی طرف سے مسلمانوں کا ایک بڑا امتحان ہونا تھا کہ اس جنگ میں جب منزلیں طے کرکے دشمن کے قلعوں کے سامنے پہونچے اور اُن کے بڑے اہم قلعہ کا محاصرہ ہوا تو حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مزاج ناساز ہو گیا اور درد شقیقہ کی تکلیف پیدا ہو گئی[3] اور آپ کے قوت بازو حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی

۱؎ تاریخ مسلمانانِ عالم حصہ اول ص ۴۳-۴۴ ۔ ۲؎ اعلام الوریٰ

۳؎ تاریخ خمیس ج ۲ ص ۴۸

جواب تک ہر جنگ میں پیش پیش رہتے تھے آنکھیں دُکھ رہی تھیں اور درد شروع ہی سے اس جنگ میں ساتھ نہیں آسکے تھے کیونکہ شدید طور پر آشوب چشم میں مبتلا تھے لہ

شروع میں کچھ ابتدائی لڑائیاں ہوئیں جن میں مسلمان فتحیاب ہوئے لیکن جب یہود کے سب سے اہم قلعہ کی باری آئی تو یہ منزل بڑی سنگلاخ ثابت ہوئی۔

ممکن ہے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر خود جنگ کے انتظامات میں حصہ لے رہے ہوتے تو اس قلعہ پر حملہ کو ملتوی رکھتے اُس وقت تک کہ جب تک علیؑ اچھے ہو کر آجائیں مگر آپ کا بدرد شقیقہ میں مبتلا ہو کر انتظامات جنگ سے کنارہ کش ہوتا تھا کہ فتح کی اُمنگ رکھنے والے "مجاہدین" نے کہ جنھیں رسولؐ سے ایک طرح کی شکایت تھی کہ ہمیں آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیتے، خود انتظامات جنگ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور قدم بھی اقدام کے لیے بڑھا دیا جس کے بعد جو ناگوار صورت پیش آئی، وہ اتنی "طشت از بام افتادہ" ہوئی کہ تاریخ ہی نہیں، کتب احادیث تک بھی پہونچ گئی اور عام کتب احادیث ہی نہیں، صحاح ستہ میں آگئی اور عام صحاح ستہ بھی نہیں بلکہ صحیح بخاری میں بھی جگہ پاگئی جسے انھی صحاح اور مستند تواریخ کے اقتباسات کی صورت میں پیش کیا جائے گا مگر دور حاضر کے ایک

لہ تاریخ خمیس جلد ۲ صہ ۴۲

صاحب قلم نے جو تاریخ کچھ حقائق پر پردہ ڈالنے کے منصوبہ کے ماتحت ہی لکھی ہے، اُس میں تمام مسلّم واقعات کو نظر انداز کرکے روداد اس طرح تحریر کی ہے:۔

"محمود بن مسلمہ حملہ آور فوج کے افسر اعلیٰ منتخب کیے گئے اور اُنھوں نے قلعہ نطاة پر فوج کشی کی۔ متواتر پانچ دن تک یکے بعد دیگرے حملے کیے مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چھٹے دن سرکار نے فوج کی پاسبانی حضرت عمر کے سپرد کی۔ آپ نے ایک یہودی جاسوس کو گرفتار کیا، جس سے بہت سے خفیہ رازوں کا پتہ چلا جو لڑائی کے لیے انتہا مفید ثابت ہوئے۔ حضرت عمر کے تقرر کے بعد سرکار نے حضرت علی کو طلب فرمایا اور قلعہ ناعم پر حملہ کے لیے ہدایات دیں۔"[1]

جو شخص واقعات سے واقف ہو وہ پورا اندازہ کر سکتا ہے کہ کس تیزی کے ساتھ یہ مصنف حقیقتوں کے اظہار سے کترایا ہے۔

جانے پہچانے مؤرخین و محدثین کے متواتر طور پر بیان کردہ واقعات کو نظر انداز کر کے اس نے جو باتیں لکھی ہیں، وہ متداول اور مستند تواریخ میں تو کہیں نظر نہیں آتیں۔ شاید اُس نے بیان واقعات کی خانہ پُری کے لیے کسی غیر معروف ماخذ میں اُن کا سراغ لگایا ہو۔ پھر سوال یہ ہے کہ جب "قلعہ نطاة پر فوج کشی میں" پے در پے حملوں سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا تو اس قلعہ کا کوئی آخری نتیجہ

---

(۱) "مسلمانان عالم" حصہ اول ص۱۳۹

سامنے آئے بغیر سرکار نے حضرت علیؑ کو ایک دوسرے قلعہ یعنی ناعم پر حملے کے لیے ہدایات کیوں دے دیں۔

محمود بن مسلمہ افسر اعلیٰ منتخب ہو گئے تھے تو پھر حضرت عمر کا تقرر کس منصب پر ہوا؟ پھر حضرت عمر کے تقرر کے بعد سرکار نے حضرت علیؑ کو کس واسطے طلب فرمایا اور طلب فرمایا تو کہاں سے؟ کیا وہ اس وقت اسی لشکر میں موجود تھے مگر طلب نہیں کیے گئے تھے یا لشکر میں موجود نہ تھے اور کہیں اور سے آپ کو طلب کیا گیا؟ آخر آپ لشکر میں کیوں موجود نہیں تھے اور کہاں تھے؟

اس سب کو اس مورخ نے صرف اس لیے معما بنا دیا ہے کہ جو اصل حقیقت تھی اس کے لکھنے کے لیے اُس میں وسعت قلب موجود نہ تھی۔

اب دوسری مستند تاریخوں نے جو واقعہ کی روئداد لکھی ہے وہ ملاحظہ ہو۔

ابوالفدا جس نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درد شقیقہ میں مبتلا ہونے کا بھی اظہار کیا ہے، اُس نے اسی علالت پر مترتب کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں۔

فاخذ ابوبکر الصدیق الرایۃ فقاتل قتالا شدیدا ثم رجع فاخذها عمر بن الخطاب فقاتل

تو (یعنی آپ کی علالت کی بنا پر) حضرت ابوبکر نے علم لے لیا اور جا کر سخت جنگ کی پھر واپس آ گئے تو اب اسے حضرت عمر نے لیا

قتالا اشد من الاولی ثم رجع فاخبر ذلک رسول اللہ صلعم له

انھوں نے پہلے سے زیادہ جنگ کی مگر پھر واپس آنا پڑا تو اب اس کی اطلاع پیغمبر خداؐ کو دی گئی ۔

ان الفاظ سے سمجھ میں یہ آتا ہے کہ ان صاحبوں کو علم حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا ہی نہیں بلکہ چونکہ آپ علیل ہو گئے اس لیے موقع پا کر ان حضرات نے خود علم لے لیا اور جب دو دن شدید اور پھر شدید تر جنگ کے بعد بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور دو صاحبان جو علم لے کر گئے بعد دیگرے گئے تھے انھوں نے اپنی سی بہت کوشش کی مگر قلعہ فتح نہیں ہوا اور بے نیل مرام واپسی ہوئی تو اب رسولؐ کو اطلاع دینے کی ضرورت محسوس کی گئی ۔

اب جو پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا اس حدیث میں جس کا ذکر ابھی بعد میں آئے گا کہ :- لاعطین الرایۃ غدا "کل میں دوں گا علم" تو ان الفاظ کا مفہوم خوب سمجھ میں آ جاتا ہے ۔ یعنی ابھی تک تو دوسرے اشخاص نے بطور خود جد وجہد یا قسمت آزمائی فرمائی تھی لیکن رسولؐ فرماتے ہیں کہ اب میں علم دوں گا اور میں دوں گا تو ایسے کو جس میں یہ اوصاف ہوں گے ۔ اب ان اوصاف کے بیان سے یقیناً یہ پہلو پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تک ان اوصاف سے متصف انسان نہیں گیا ہے اور اب تاریخ کے اس فقرہ سے جو ہر دفعہ ہے کہ

له تاریخ ابو الفداء ج ۱ صفحہ ۱۸۷

"ثم رجع" "پھر وہ واپس آگئے" "ثم رجع" "پھر وہ واپس آگئے"۔
اس کے بعد رسول ؐ کے اس ارشاد کے معنی سمجھ میں آتے ہیں کہ

لا یرجع حتی یفتح اللہ علی یدیہ۔

وہ نہیں پلٹے گا جب تک کہ اللہ اُن کے ہاتھوں پر قلعہ کو فتح نہ کرے۔

حافظ نسائی کی روایت کے الفاظ خصائص میں یہ ہیں:۔

فاخذ الرایۃ ابوبکر ولم یفتح لہ فاخذہ من الغد عمر فانصرف ولم یفتح لہ واصاب الناس شدۃ وجھد فقال رسول اللہ ؐ انی دافع لوائی غدا الی رجل یحب اللہ ورسولہ ویحبہ اللہ ورسولہ لا یرجع حتی یفتح لہ۔

ابوبکرؓ نے علم لے لیا اور قلعہ اُن سے فتح نہ ہوا تو دوسرے دن عمر نے لیا۔ نتیجہ میں وہ بھی واپس آگئے اور فتح حاصل نہ ہوئی اور لوگوں کو بڑی سختی اور زحمت سے دوچار ہونا پڑا۔ تو اب رسول خدا نے فرمایا کہ میں اپنا علم کل اُس مرد کو دوں گا جو اللہ اور اُس کے رسول کو دوست رکھتا ہے اور اسے اللہ اور اس کا رسول ؐ دوست رکھتے ہیں وہ واپس نہیں آئے گا جب تک کہ اُسے فتح حاصل نہ ہو جائے۔

متاخرین علمائے تاریخ و حدیث میں سے شاہ عبدالحق دہلوی تحریر فرماتے ہیں:۔

چوں قلعۂ غموص از قلاع دیگر در استحکام زیادہ بود فتح آں

چونکہ قلعۂ غموص دوسرے قلعوں سے زیادہ مضبوط تھا، آسانی سے فتح

maablib.com

با مانی روے نمود آوردہ اند
کہ روزے عمر رضی اللہ عنہ علم
برداشتہ با جمعے از حامیان حوزہ
اسلام بپائے قلعہ آمد و چندانکہ
بذل مجہود نمود روئے مراد ندید
روز دیگر ابوبکر صدیق رضی اللہ
عنہ رایت برگرفتہ و با طائفہ
از شجعان و ابطال بقتال
وجدال ارباب ضلال مبادرت
نمودہ مقاتلات عظیمہ درمیان
آوردہ بے نیل مقصود بازگشت
و نوبت سوم باز عمر بن الخطاب
با زمرۂ از اصحاب محاصرہ و
محاربہ نمود عنان مراد بدست
نیاوردہ مراجعت نمود۔[1]

نہ ہو سکا۔ (مؤرخین) بیان کرتے ہیں
کہ ایک دن حضرت عمر علم اٹھا کر مرکز
اسلام کے محافظ افراد کی ایک جماعت کے
ساتھ قلعہ کی طرف گئے اور جتنی بھی کوشش
کر سکتے تھے کی مگر مراد کا چہرہ نہ دیکھ سکے
دوسرے دن حضرت ابوبکر نے علم
لے لیا اور بہادروں اور سورماؤں کے
ایک گروہ کو ساتھ لے کر گمراہ جماعت سے
جنگ و پیکار کے لیے بڑھے اور بڑی
سخت لڑائیاں لڑیں مگر بغیر حصول
مقصد کے واپس آ گئے، تیسری مرتبہ پھر
حضرت عمر نے اصحاب کے ایک گروہ
کے ساتھ جا کر گھیر ڈالا اور جنگ کی
مگر مراد کی باگ ہاتھ میں نہ لا کر واپسی
اختیار فرمائی۔

یہ قلعہ "قموص" جسے اس عبارت میں "غموص" لکھا گیا ہے ان تمام قلعوں میں سب سے زیادہ مضبوط تھا اور مرکزی حیثیت رکھتا تھا جو ایک پہاڑ پر واقع تھا اور در حقیقت قموص نام اس پہاڑی کا

---

[1] مدارج النبوۃ، ج ۲ ص ۳۲۲

تھا جس سے یہ قلعہ بھی مشہور ہو گیا۔[۱]

جیسا کہ فاضل متتبع سید سبط الحسن صاحب ہنسوی نے لکھا ہے۔

"یہ قلعہ چونکہ اس پوری یہودی ریاست کا محفوظ کرنے والا باب تھا اس لیے اس قلعہ قموص پر خیبر کا اطلاق ہوتا تھا،

جیسا کہ علامہ زرقانی متوفی ۱۱۲۲ھ اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

الحصن المسمّٰی بالقموص وکان من اعظم حصونهم کما فی الفتح وھو المعبّر عنہ بخیبر فی الحدیث الذی فوقہ لکونہ من اعظمھا۔
(الزرقانی علی المواہب جلد دوم صفحہ ۲۳۰۔ طبع مصر)

قموص نامی قلعہ تمام قلعوں سے زیادہ مستحکم و عظیم تھا جیسا کہ فتح الباری میں ہے اور یہی قلعہ بسبب اپنی عظمت اور بزرگی اور استحکام کے اس خبر میں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے خیبر کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے[۲]

ارشاد حضرت احمد مختار اور صحابہ رسول کی کیفیت انتظام

گزشتہ عبارتوں میں مؤرخین و محدثین نے حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے کتنے ہی محتاط یا مہذب الفاظ صرف کیے ہوں

---

[۱] معجم البلدان ج ۷ صفحہ ۱۴۹ و تاریخ خمیس ج ۲ صفحہ ۵۴ طبع مصر [۲] فتح خیبر صفحہ ۱۰۹

مگر ان سب کا ماحصل یہی ہے کہ اس کے پہلے جتنی کوششیں قلعہ کے فتح کرنے کی ہوئیں سب ناکام رہیں اور ان سے مسلمانوں کو ایک طرح کی ذلت سے دوچار ہونا پڑا جس کے ذمہ دار اگرچہ حضرت پیغمبر خدا نہ تھے اس لیے کہ جیسا قبل میں آ چکا بظاہر حضرت کی ناسازیِ مزاج کی وجہ سے یہ سب اقدامات بطور خود کر لیے گئے تھے مگر ان کا اثر پیغمبر پر پڑنا لازمی تھا۔ اب بظاہر حضرت کے دردِ سر کی تکلیف میں بھی کچھ کمی ہو گئی تھی، اس لیے آپ اپنے خیمہ سے ممکن ہے پہلی دفعہ جب برآمد ہوئے ہوں تو ان دو تین دن کی کیفیت از خود دریافت فرمائی ہو یا کچھ مسلمانوں نے با حال پریشان خود ہی حضرت سے اسے بیان کیا ہو جسے سننے کے بعد حضرت نے یہ تاریخی اعلان فرمایا جو احادیث کے جوامع صحاح اور مستند کتب تاریخ دونوں ہی میں موجود ہے، جس کے بالکل متفق علیہ الفاظ تو اتنے ہیں:—

لاعطين الراية غداً رجلاً يحب الله ورسوله ويحبه الله ورسوله۔	ضرور بالضرور میں کل یہ علم اس آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوگا اور اللہ اور رسول اسے دوست

اگر صرف اتنے ہی الفاظ ہوں تو بھی ان میں وہ تمام پہلو مضمر ہیں جو بڑی اہم حقیقتوں کے روشن کرنے والے ہیں۔

"کل اسے دوں گا"— اس "کل" کے حالی میں "مستقبل" کی

اُمید افزا خوش خبری کے ساتھ ضمنی پر تاریخی تبصرہ بھی ہے اور اللہ اور رسول ؐ کو دوست رکھنے کے جملہ میں ثبات قدم اور فتح و ظفر کے اس راز کا اظہار بھی ہے کہ یہ باتیں اللہ اور رسول ؐ اور دوسری لفظوں میں اُس مشن کے ساتھ جو خدا اور رسول ؐ کا نصب العین ہے یعنی دین حق کے ساتھ سچی الفت اور عشق ہی سے پیدا ہوتی ہیں اور جب تک دل کے اندر یہ چیز نہ ہو، اُس وقت تک کتنے ہی بلند بانگ دعوے کیے جائیں نہ خطرات کے برداشت کی قوت پیدا ہوتی ہے نہ قدموں میں ثبات آتا ہے اور نہ پھر مدد الٰہی بھی شامل حال نہیں ہوتی۔

اور بندہ کی یہ صفت شوق و جذب کی جب ہوتی ہے تو اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ اور رسول ؐ اُسے دوست رکھتے ہیں۔ ایسے عمومی طور پر ایک وصف ذات کی حیثیت سے بھی دیکھا جا سکتا ہے اور عین اس موقع کی خصوصیت سے بھی جس سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کے پہلے جن کے سپرد یہ علمداری کا منصب ہوا وہ مخلوق کی پسند بھی جو خالق اور اُس کے رسول ؐ کی پسند کے مطابق نہ تھی اور اُس کا نتیجہ سب کے سامنے آگیا لہٰذا جب ایک جزئی معاملہ میں خالق اور اُس کے رسول ؐ کی مرضی کے بغیر اپنی پسند سے کام لے کر یہ زک اُٹھا لی تو اب آئندہ تو کبھی اس سے زیادہ وسیع دائرہ میں خدا اور رسول ؐ کی مرضی کو نظر انداز کر کے خود رائی سے کام نہ لینا چاہیے۔

اب کچھ خصوصی الفاظ ہیں جو الگ الگ روایتوں میں یا تاریخوں میں مختلف طور پر وارد ہوئے ہیں مثلاً ابوالفداء میں ہے :-

اما واللہ لاعطین الرایۃ غداً رجلاً یحب اللہ و رسولہ و یحبہ اللہ و رسولہ کراراً غیر فرار یاخذھا عنوۃ[1]

معلوم ہونا چاہیے کہ قسم اللہ کی میں یہ جھنڈا یقیناً کل اُس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہو اور اللہ اور اُس کے رسول اُسے دوست رکھتے ہوں وہ بڑھ بڑھ کر حملے کرنے والا ہو اور پیٹھ پھرا کر بھاگنے والا نہیں وہ اس قلعہ کو قوت بازو سے فتح کرے

اس میں شروع میں کلمۂ تنبیہ اور قسم کا اضافہ ہے اور اوصاف میں کرار غیر فرار کی صفت اور آخر میں اُس کی کامیابی کا یقینی طور پر اعلان کہ وہ اس قلعہ کو فتح کر کے رہے گا۔

علامہ طبرسی کی روایت میں وہ الفاظ ہیں جو اس حدیث کے سلسلہ میں زبان زد خلائق ہیں :-

لاعطین الرایۃ غداً رجلاً کراراً غیر فرار یحب اللہ و رسولہ و یحبہ اللہ و رسولہ لا یرجع حتی یفتح اللہ علی یدیہ[2]

اس میں اور ابوالفداء والی روایت میں بس اتنا فرق ہے کہ اس میں کلمۂ تنبیہ اور شروع والی قسم (اما واللہ) نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کرار غیر فرار کا وصف محبت خدا و رسول کے بعد تھا اور یہاں اُس کے پہلے ہے۔ وہاں آخر میں یاخذھا عنوۃ

---

[1] تاریخ ابوالفداء ج ۱ ص ۱۸۱ [2] اعلام الوریٰ

تھا کہ "وہ اس قلعہ کو قوت و طاقت کے ساتھ لے گا" اور یہاں ہے یفتح اللہ علیٰ یدیہ "اللہ اس کے ہاتھ پر فتح عنایت کرے گا"۔
سیرت کے الفاظ یہ ہیں:۔

لاعطین الرایۃ غدا رجلا یحب اللہ و رسولہ یفتح اللہ علیٰ یدیہ لیس بفرار[1]

اس میں کرار غیر فرار کی صفت بیچ میں آنے کے بجائے آخر میں لیس بفرار آگیا ہے جس سے اس صفت پر زیادہ زور پڑتا ہے کہ وہ بھاگنے والا نہیں ہے"۔

اس سے ظاہر ہے کہ پہلے کی ناکامیوں کو ہم جس طرح بھی نرم سے نرم الفاظ میں ادا کریں مگر پیغمبرؐ کی نظر میں ان کی حقیقت یہی تھی جس کی نفی اب اس فرد سے جسے علم دینے والے ہیں آپ بڑے اطمینان و یقین کے انداز میں فرما رہے ہیں۔

خصائص نسائی میں ہے:۔

انی دافع لوائی غدا الی رجل یحب اللہ و رسولہ و یحبہ اللہ و رسولہ لا یرجع حتی یفتح لہ[2]

اس میں شروع میں لاعطین کے بجائے دافع لوائی کے الفاظ ہیں اور درمیان یا آخر میں کہیں کرار غیر فرار کا جز نہیں ہے۔

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۱۸۴
[2] خصائص امیر المومنین للنسائی طبع نجف اشرف ۱۳۶۹ھ ۱۹۴۹ء ص ۷

یہ اختلاف حدیث کے الفاظ میں کوئی معنوی اختلاف نہیں ہے بلکہ راویوں نے رسولؐ کے ارشاد کو اپنی اپنی لفظوں میں نقل کیا ہے۔ ان میں چونکہ زیادہ تر راویوں کی زبان پر لا عطین ہے۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ اصل لفظ جو رسولؐ نے ارشاد فرمائی تھی وہ یہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ دو فقرے بالکل یقینی ہیں کہ یحب اللہ و رسولہ و یحبہ اللہ و رسولہ۔ متعدد راویوں نے کسی نے بیچ میں اور کسی نے آخر میں کرّار غیر فرّار کے مفہوم کو ادا کیا ہے اور وہ عطائے علم کے پس منظر کے اعتبار سے بھی واقعیت کے بالکل مطابق ہے۔ اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ یہ فقرہ بھی حضرتؐ نے ارشاد فرمایا تھا جو کسی راوی کے ذہن سے اتر گیا اور اس نے بیان نہیں کیا۔

اب ؟ اب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اعلان کا یہ تو ایک فطری نتیجہ ہونا چاہیے کہ پوری جماعت کو شدید بے چینی کے ساتھ نتیجہ کا انتظار پیدا ہو جائے کہ دیکھیے یہ علم کس کو ملتا ہے ؟ مگر منطوق اور بعنت ادب سب کے رو سے ان افراد کو امید نہ ہونا چاہیے جو اس کے پہلے علم کو لے جا چکے ہیں مگر انسانی دل و دماغ کے اس تقاضہ کو کیا کیا جائے کہ اکثر دلی جذبات دماغ کے فیصلوں پر غالب آجاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کے پہلے تاریخ میں جو ایک فقرہ یہ بھی آیا ہے جو فطرت کے بالکل مطابق ہے فبتجہم

دیکھتو نہ (یعنی) مروتر یہ صورت پیدا ہوتی تھی کہ سردارِ لشکر فوج کو
بزدل بتاتا تھا کہ انھوں نے کمزوری دکھائی ورنہ قلعہ فتح ہو جاتا
اور فوج سردار لشکر پر بھی الزام عائد کرتی تھی۔ تو اس صورتِ
حال کی بنا پر اس وقت شاید یہ اُمید کی جارہی ہو کہ رسولؐ نے
ان شکستوں کا ذمہ دار عام فوجیوں کو سمجھا ہو لہذا ایک تازہ دم
جماعت کی معیت میں علم پھر اُنھی افراد میں سے کسی کو مل جائے
جو اس سے پہلے جا چکے تھے اور اس طرح فتح کا سہرا اُن کے سر بندھ
جائے حالانکہ الفاظ پیغمبر خدا میں اس تصور کی گنجائش کم ہے
کیونکہ عطائے رایت فوجیوں کو نہیں ہوتا۔ سردار فوج ہی کو ہوتا
ہے اور جسے رایت عطا کیا جائے اُس کے صفات و کردار کو رسولؐ
نے نمایاں کیا ہے مگر وہی بات کہ جذباتی تمنائیں عقل و منطق کی
گہرائیوں میں جانے کی متحمل نہیں ہوا کرتیں۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو
لیکن تاریخ واقعہ یہی بتاتی ہے کہ پوری فوج اسلام نے یہ رات
تقریباً پوری جاگ کر گزار دی اس اشتیاق و انتظار میں کہ صبح کو
دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ایک پہلو سے تقریباً اطمینان تھا کہ بہرحال
ہم ہی میں سے کسی ایک کو یہ علم ملے گا۔ اس لیے کہ وہ جو ہر
میدان میں آگے رہا کرتا تھا اس وقت موجود ہی نہیں ہے اور
آشوب چشم کی وجہ سے بلایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کیفیت کو ہمارے
مؤرخ علامہ طبری نے عجیب انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

فغدت قريش يقول بعضهم لبعض اما علی فقد كفيتموه فانه ارمد لا يبصر موضع قدمه وقال علی عليه السلام لما سمع مقالة رسول الله اللهم لا معطی لما منعت ولا دافع لما اعطيت [۵۱]

قریش کے لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ علی کے میدان میں آنے کا خطرہ تو ہے ہی نہیں کیونکہ اُن کی آنکھیں اس شدت سے آئی ہوئی ہیں کہ وہ اپنے پیر رکھنے کی جگہ بھی نہیں دیکھ سکتے اور حضرت علی تک جب پیغمبر خدا کے ان الفاظ کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے دربار الٰہی میں عرض کیا پروردگارا جسے تو محروم رکھنا چاہے اُسے کوئی کچھ دے نہیں سکتا اور جسے

ان مختصر الفاظ میں "تمنائے بے قرار" کے ساتھ اپنی مجبوری کے احساس سے ایک "حسرت و یاس" اور پھر فضل الٰہی سے ایک "امیدواری" کی وہ سموئی ہوئی کیفیت ہے جس کا اظہار کسی بسیط تقریر سے بھی مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔

اِدھر کا کیا عالم تھا؟ اُسے مورخین الفاظ ذیل میں لکھتے ہیں:

فتطاول المهاجرون والانصار [۵۲] فما منا انسان له منزلة عند الرسول الا وهو يرجو ان يكون صاحب اللواء [۵۳]

مہاجرین و انصار سب گردنیں اونچی کر کرکے نگراں ہوئے اس کے بعد کوئی بھی شخص جس کا پیغمبر خدا کے یہاں کوئی مقام ہو سکتا تھا ایسا نہ تھا جو یہ امید رکھتا ہو کہ وہی آج علمدار

---

۵۱ اعلام الورٰی۔ ۵۲ ابو الفداء ج ۱ ص ۱۴۶

۵۳ خصائص نسائی مطبوعہ نجف ص ۶

صبح کا منظر اور علیؑ کی طلبی

جہاں رات اتنی بے چینی سے گزاری ہو وہاں کی صبح کے عالم کا کیا پوچھنا۔ یقین جاننا چاہیے کہ ابھی پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم خیمہ سے برآمد نہیں ہوئے کہ درِ خیمہ پر مسلمانوں کے ٹھٹھ لگ گئے۔ اور جو جو وجیہ افراد اس منصب کے اُمیدوار ہو سکتے تھے وہ تمام مجمع کو چیرتے پھاڑتے آگے کی صف میں جا جا کر بیٹھے کہ پیغمبر خدا کی نگاہ ہم پر پڑ جائے۔ اب اس موقع کا حال پھر پہلے علامہ طبرسی کے الفاظ میں دیکھیے:-

فاصبح رسول اللہ و اجتمع الیہ الناس قال سعد جلست نصب عینیہ ثم جثوت علی رکبتی ثم قمت علی رجلی قائما رجاء ان یدعونی فقال ادعوا الی علیا فصاح الناس من کل جانب انہ ارمد رمدا لا یبصر موضع قدمہ فقال ارسلوا الیہ وادعوہ[1]

صبح ہوئی اور پیغمبر خداؐ کے پاس تمام لوگ جمع ہوئے۔ سعد بن وقاص کا بیان ہے کہ میں بالکل آپ کی آنکھوں کے سامنے بیٹھا، پھر گھٹنے کے بل اونچا ہو کر بیٹھ گیا پھر سیدھا کھڑا ہو گیا اس امید میں کہ حضرت مجھ کو بلا لیں مگر آپ نے فرمایا کہ علی کو میرے پاس بلا لاؤ۔ یہ سننا تھا کہ سب لوگ چاروں طرف سے چیخنے لگے کہ ان کی آنکھیں تو آشوب چشم میں ایسا کہ اپنے پیروں کے نیچے کی زمین نہیں دیکھ سکتے آپ نے فرمایا کہ جو بھی ہو کسی کو ان کے پاس

---

[1] اعلام الوریٰ۔

اس کے بعد اب دوسری تاریخوں کے بیانات ملاحظہ کیجیے:۔

حافظ نسائی نے بریدہ سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

فلما اصبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی الغداۃ ثم جاء فاتما ودعا باللواء فما منا انسان لہ منزلۃ عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا وھو یرجوان یکون صاحب اللواء فدعا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ[1]

صبح ہوئی تو رسول خدا نے صبح کی نماز ادا فرمائی اس کے بعد تشریف لا کر کھڑے ہو گئے اور علم طلب فرمایا تو کوئی آدمی ہم میں سے ایسا نہ تھا جسے پیغمبرؐ کے یہاں کوئی مقام حاصل ہو مگر یہ کہ وہ امید رکھتا تھا کہ وہی علم دار ہوگا، لیکن حضرتؐ نے علی بن ابی طالب کو طلب فرمایا۔

دیار بکری رقم طراز ہیں:۔

روی ان الناس لما اصبحوا غدوا الی رسول اللہؐ واجتمعوا علی بابہ وفی المنتقی لما کان من الغد تطاول لہا ابوبکر وعمر وقریش ویرجو کل واحد

روایت میں ہے کہ جب صبح ہوئی تو تمام لوگ سویرے ہی پیغمبر خدا کی طرف روانہ ہوئے اور آپ کے دروازہ پر جمع ہو گئے اور کتاب منتقی میں ہے کہ جب دوسرا دن ہوا تو ابوبکر اور عمر اور تمام قریش نے گردنیں بلند کیں اور ہر ایک

[1] خصائص امیر المومنین مطبوعہ نجف ص۷

ان یکون هو صاحب ذلك
وعن سعد بن ابی وقاص
قال جئت فبرکت بحذاء
النبی صلی الله علیه وسلم
ثم قمت ووقفت بین
یدیه وعن عمر بن
الخطاب انه قال ما احببت
الامارة الا ذلك الیوم
ثم خرج النبی صلی الله
علیه وسلم من خیمته و
قال این علی بن ابی طالب
فقیل هو یشتکی عینیه ـــ
فقال رسول الله صلی الله
علیه وسلم ارسلوا الیه
من یأتی به ۔[1]

کہ وہی رسول ؐ کے اعلان کا مصداق
ہو اور سعد بن ابی وقاص کا بیان ہے
کہ میں آیا اور رسول ؐ کے سامنے
گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا پھر اٹھا اور آپ
کے سامنے کھڑا ہو گیا اور عمر بن خطاب کا
بیان ہے کہ مجھے سوا اس دن کے کبھی
سرداری کی خواہش نہیں ہوئی۔ پھر
پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم
اپنے خیمہ سے برآمد ہوئے اور فرمایا
علی بن ابی طالب کہاں ہیں؟
کہا گیا کہ ان کی تو آنکھیں دکھ رہی
ہیں ـــ حضرت پیغمبر خدا صلے
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
کسی کو بھیجو کہ وہ انھیں لے
آئے ۔

بریدہ اسلمی کی روایت میں عام مجمع کی کیفیت کو چھوڑ کر دو ہی
شخصیتوں کے نام لیے گئے ہیں :-

فلما کان من الغد تطاول لها
ابو بکر و عمر فدعا علیا[2]

جب دوسرا دن ہوا ابوبکر اور عمر گردنیں لمبی کر کے
اس کے امیدوار ہوئے مگر حضرت نے علیؑ کو بلوایا۔

---

[1] تاریخ خمیس ج ۲ ص ۴۸ [2] تاریخ طبری مطبع حسینیہ مصر ج ۳ ص ۹۳

بس اب آخر میں ایک قدیم ترین مؤرخ واقدی کا بیان درج کیا جاتا ہے جس میں خاص انفرادیت پائی جاتی ہے :-

فعد الناس الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما اخذ القوم راياتهم اخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برآیته فهزها ودعا ربه ثم اعطاها علی بن ابی طالب[ل]

لوگ آکر حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے پاس بیٹھے جب تمام لوگ اپنے اپنے جھنڈوں سمیت آگئے تو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے علم کو ہاتھ میں لے کر اُسے جنبش دی اور اپنے پروردگار سے دعا مانگی پھر اُسے علی ابن ابی طالبؑ کے حوالے کردیا۔

حضرت علیؑ کی آمد اور پھر اُس کے بعد

علامہ طبرسیؒ نے لکھا ہے :-

فاتی به يقاد فوضع رأسه علی فخذه ثم تفل فی عینیه فقال فکان عینیه جزعتان ثم اعطاه الرایة[ع]

علیؑ کو ہاتھ پکڑ کر لایا گیا تو حضرتؐ نے آپؑ کے سر اپنے زانو پر رکھ کے آنکھوں میں اپنا لعاب دہن ڈالا یا تو فوراً آنکھیں صحیح و سالم ہو گئیں اس کے بعد اپنا علم دے دیا۔

اب مادی سائنس کے پرستار اس کی جو چاہیں توجیہ کریں مگر یہ واقعہ تو مسلّم ہے جیسے تمام دوسرے مورخین بھی یونہی لکھ رہے ہیں۔

سیرت میں ہے :-

ل کتاب المغازی للواقدی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۵ء ج ۱ ص ۳۹۱

ع اعلام الوریٰ۔

فدعا رسول اللہ ص علیاً رضوان اللہ علیہ وھو ارمد فتفل فی عینیہ ثم قال خذ ھذہ الرایۃ فامض بھا حتی یفتح اللہ علیک[۵۱]

حضرت پیغمبر خدا نے حضرت علی ع کو بلایا اس عالم میں کہ وہ آشوب چشم میں مبتلا تھے تو اُن کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن ڈالا پھر فرمایا اب یہ علم لے کر جاؤ گے اللہ تمھارے ہاتھوں فتح کی صورت نصیب کرے۔

طبری نے لکھا ہے:-

فدعا علیا وھو ارمد فتفل فی عینیہ واعطاہ اللواء[۵۲]

تاریخ ابو الفدار میں ہے:-

وکان علی بن ابی طالب غائبا فجاء وھو ارمد قد عصب عینیہ فقال لہ رسول اللہ ص ادن منی فدنا منہ فتفل فی عینیہ فزال وجعھما ثم اعطاہ الرایۃ[۵۳]

علی بن ابی طالب ع وہاں موجود نہ تھے وہ آئے تو اس حال میں کہ آشوب چشم کی وجہ سے دونوں آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی حضرت ص نے فرمایا میرے قریب آؤ وہ قریب گئے تو آپ نے اپنا لعاب دہن اُن کی دونوں آنکھوں میں ڈال دیا تو اُن کی تکلیف دور ہو گئی۔ پھر آپ نے انھیں علم عطا فرمایا۔

خصائص نسائی میں بریدہ کی ایک روایت میں ایک جزء کا اضافہ ہے اس طرح کہ:-

---

۵۱ ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۱۸۱ ۵۲ تاریخ طبری مطبوعہ مطبع حسینیہ ج ۳ صفحہ ۹۳
۵۳ تاریخ ابو الفدا ج ۱ صفحہ ۱۴۷

فتفل ومسح فی عینیہ فدفع اللواء[۱]	تھوکا اور اپنا ہاتھ اُن کی آنکھوں پر مل دیا۔ اس کے بعد علم دیا۔

ظاہر ہے کہ تاریخ کا کام صرف اس واقعہ کا اظہار ہے۔ آپ اس پر کوئی بحث کہ لعاب دہن کا یہ اثر کیونکر ہوا کہ اُس سے آنکھیں فوراً روشن ہو گئیں؟ تاریخ کے دائرہ سے خارج ہے۔ مذہبی زبان میں اسے رسولؐ کا معجزہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے لعاب دہن میں خالق نے یہ حیرت انگیز تاثیر ودیعت فرمائی تھی۔

مورخ دیار بکری نے لکھا ہے کہ علیؑ شفایاب ہو گئے تو رسولؐ نے اپنی فولادی زرہ اُن کے زیب جسم فرمائی اور ذوالفقار اُن کی کمر میں لگا دی اور پھر علم عطا فرمایا۔[۲]

علامہ ابن القیم تحریر کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! کیا میں اُن سے اُس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ ہمارے ایسے نہ ہو جائیں یعنی اسلام قبول نہ کر لیں۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ پہلے پُر امن طریقہ پر جا کر اُن کے حدود میں ٹھہرو، پھر اُنھیں دعوت اسلام دو اور اُنھیں بتاؤ کہ اُن پر اللہ کی طرف سے کیا فریضہ عائد ہے۔ بخدا تمھارے ذریعہ سے کسی ایک کی ہدایت ہو جائے، یہ ہر قیمتی شے سے تمھارے لیے زیادہ قیمت رکھنے والی چیز ہے۔[۳]

۱؎ خصائص امیر المومنین طبع نجف ص۶ ۲؎ تاریخ خمیس ج ۲ ص ۴۹

۳؎ زاد المعاد فی ہدی خیر العباد مطبوعہ مطبع نظامی کانپور نصف اول ص ۳۲۴

اس سے اسلامی فتح کا معیار ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں نصب العین کسی ملک پر قبضہ کرنا نہیں ہے بلکہ خلق خدا کو پُر امن طریقہ پر راہ راست کی طرف دعوت دینا ہے۔ اگر وہ خود خونریزی پر آمادہ نہ ہو جایا کریں تو جنگ کا سوال ہی نہیں۔ جنگ تو اس لیے ہوئی کہ انھوں نے دعوت اصلاح کا مقابلہ ہتھیاروں سے کرنا چاہا تو مجبوراً اُن کے دفعیہ کے لیے ہتھیار ہاتھ میں اٹھائے گئے۔

حضرت علیؑ کی پیش قدمی اور مرحب سے مقابلہ

حضرت علیؑ کا اپنی معذوری سے وہ احساس مجبوری اور رسولؐ کی حدیث کو سُننے کے بعد وہ بارگاہ الٰہی میں عاجزانہ عرض داشت اور پھر خلاف توقع اس طرح طلب کیا جانا اور پھر غیر معمولی صورت سے مرض کا دفعیہ اور علمداری کے منصب کا عطا ہونا، اس کے بعد یہ کیفیت جوشِ مسرت اور ولولۂ شجاعت میں بالکل فطری حیثیت رکھتی ہے جب علامۂ طبرسی نے بھی لکھا ہے کہ علم پانے کے بعد حضرت علیؑ دوڑتے ہوئے میدان کی طرف روانہ ہوئے [1]

اس "دوڑنے" کی سی کیفیت کا ذکر سیرت ابن ہشام (ج ۲ صفحہ ۔۔ طبع مصر) اور تاریخ خمیس (ج ۲ صفحہ ۴۹ طبع مصر) وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

فوج والے تو ابھی یہ منظر دیکھنے میں مصروف تھے اور بے تابانہ اشتیاق کے ساتھ نتیجہ کے منتظر۔ لہٰذا میدان میں جانے کی تیاری

---

[1] اعلام الوریٰ۔

کس نے کی تھی؟ مگر سالار فوج اب وہ ہوا ہے جسے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ وہ فوراً آگے بڑھتا ہے تو ساتھ کون جا رہے؟! جابر کا بیان ہے کہ آپ اتنے جلدی روانہ ہو گئے کہ ہمیں ہتھیار لگانا مشکل ہو گئے، اور سعد بن وقاص نے پکار کر کہا۔

یا ابا الحسن اربع حتی یلحقک الناس[1]	اے ابوالحسن ذرا ٹھہریے کہ اور لوگ پہنچ جائیں۔

سلمہ کہتے ہیں۔

وانا خلفہ نتبع اثرہ[2]	ہم لوگ آپ کے پیچھے آپ کے نقش قدم دیکھتے جا رہے تھے۔

ایک جگہ جابر کا بیان یہ ملتا ہے کہ لوگ کہہ رہے تھے "یا علیؑ! رحم کیجیے، یعنی اتنی جلدی نہ کیجیے۔"

حضرت امیرؑ نے قلعہ کے سامنے جا کر نیزہ اپنا زمین میں گاڑ دیا جس کا محولہ بالا تمام ماخذوں میں ذکر ہے۔ ممکن ہے یہ اشارہ ہو اس بات کے اعلان کا کہ آج میدان میں آنے والا بغیر قلعہ فتح کیے واپس جانے والا نہیں ہے۔ ان تیوروں ہی سے قلعہ والوں میں ہلچل مچ گئی۔

خیبر والوں کا سب سے بڑا مایۂ ناز سورما تو مرحب تھا جو غالباً اس قلعہ میں حاکم کی حیثیت رکھتا تھا مگر اُس کا چھوٹا بھائی حارث بھی اپنی جگہ بڑا بہادر سمجھا جاتا تھا اور اب تک مسلمانوں کی فوج کے

---

[1] اعلام الوریٰ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۸۸ و تاریخ خمیس ج ۲ ص ۹

مقابلہ کے لیے وہی کافی سمجھا جاتا رہا تھا چنانچہ فطری طور پر آج بھی میدان میں وہی نکلا۔ اس کے علاوہ عنتر وغیرہ کچھ اور بہادروں کے نام بھی تاریخ میں آئے ہیں۔

ان میں سے یکے بعد دیگرے ہر ایک نے حضرت علیؑ کا مقابلہ کیا اور علیؑ کی تلوار سے اُس کا خاتمہ ہوا۔ ان سب کے بعد چار ناچار خود مرحب ہی میدان میں آسکتا تھا چنانچہ وہ نکلا۔

چونکہ اسی کی اہمیت زیادہ تھی اس لیے تواریخ نے اسی سے مقابلہ کی کیفیت ذرا تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ علامۂ طبرسی لکھتے ہیں:۔

فخرج الیہ مرحب فی عادیۃ الیہود فبارزہ فضرب رجلہ فقطعھا وسقط۔[1]	مرحب یہودیوں کی خاص طاقتور جماعت کے ساتھ میدان میں آیا تو آپ نے اُس سے مقابلہ کیا اور تلوار اُس کے پیر پر لگا کر اُسے کاٹ دیا جس سے وہ گر گیا۔

مگر دوسری روایت اس کے خلاف یہ ہے کہ آپ نے سر پر تلوار لگائی چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:۔

مرحب پیش دستی نمودہ خواست کہ تیغے بر سر علی زند پس امیر کبیر سبقت جستہ ذوالفقار بر سر آں	مرحب نے سبقت کر کے چاہا کہ حضرت علیؑ کے سر پر تلوار لگائے مگر جناب امیرؑ نے سبقت کر کے ذوالفقار اُس

[1] اعلام الوریٰ۔

ملعون غدار از خود دو آورد چنانکہ از سر خود و دستارش گزشتہ تا بحلق و بروایتے تا بہ پرانہائے وے و بروایتے تا بقا بوس زین او رسید و دو نیم ساخت۔

غدار ملعون کے سر پر ایسی ماری کہ اُس کے خود اور پگڑی میں سے گزر کر حلق تک اور ایک روایت کے مطابق اُس کی رانوں تک اور ایک روایت کے موافق اُس کے گھوڑے کی زین تک پہونچ گئی اور دو ٹکڑے کر دیئے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محدث دہلوی کے پیش نظر کئی روایتیں ہیں جو اس بارے میں کہ تلوار سر پر لگائی گئی تھی متفق ہیں۔ ہمارے یہاں شہرت عام بھی اسی کو حاصل ہے چنانچہ ملا رفیع باذلی نے بھی حملۂ حیدری میں اپنے پُر زور انداز میں اسی کو نظم کیا ہے۔

دوسرے مستند مورخین کی تصریحات بھی اسی کے مطابق ہیں طبری میں ہے :-

فضربہ علیؑ علی ھامتہ حتی عض السیف منھا باضراسہ وسمع اھل العسکر صوت ضربتہ۔

حضرت علیؑ نے اُس کے سر پر تلوار لگائی یہاں تک کہ تلوار کاٹتی ہوئی اُس کے دانتوں تک پہونچی اور اہل لشکر نے اُس ضرب کی آواز کو سُنا۔

دیار بکری نے معالم التنزیل کے حوالہ سے لکھا ہے :-

اراد مرحب ان یضرب علیا فسبقہ علیؑ فعلاہ

مرحب نے چاہا کہ حضرت علیؑ پر ضرب لگائے مگر آپ نے سبقت کر کے

لہ مدارج النبوۃ مطبوعہ نولکشور ج ۲ صفحہ ۳۲۵ ۲ تاریخ طبری مطبع حسینیہ مصر ج ۳ صفحہ ۹۳

بالسیف وھو ذو الفقار فتترس مرحب فوقع السیف علی الترس فقدّہ والحجر والمغفر والعمامة وفلق ھامته حتی اخذ السیف فی الاضراس

اپنی تلوار جو ذوالفقار تھی اُس کے سر پر بلند کی۔ مرحب نے سپر سے روکا تو تلوار سپر پر پڑی اور اُسے کاٹ دیا اور پتھر کو کاٹا اور خود کو اور عمامہ کو اور اُس کے سر کو شگافتہ کیا یہاں تک کہ تلوار اُس کے دانتوں میں پہونچ گئی۔

اس سب کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ علامہ طبرسی نے یہ کیونکر لکھ دیا کہ حضرت نے تلوار اُس کے پیر پر لگائی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ممدوح نے یہ مقام کسی ماخذ کو سامنے رکھ کر تحریر نہیں کیا بلکہ بس اپنے ذہن پر اعتماد کر کے یاد پر لکھ دیا اس لیے جنگ خندق میں عمرو بن عبدود کے مقابلہ میں حضرت علیؑ نے جو ضرب لگائی تھی اور وہ اُس کے پیروں پر تھی، وہ اشتباہ کے طور پر مرحب سے متعلق ہو گئی جسے "خطائے بزرگاں" میں محسوب کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

حیرت انگیز طاقت کے مظاہرے اور فتح خیبر کی تکمیل

مرحب کے قتل ہونے کے بعد علامہ طبرسی نے تو معلوم نہیں کیوں؟ غیر معمولی اختصار سے کام لے کر صرف اتنا لکھ دیا ہے کہ:-

حمل علیؑ والمسلمون علیھم فانھزموا۔

حضرت علیؑ اور مسلمانوں نے اُن پر حملہ کر دیا تو انھوں نے شکست کھائی۔

مگر دوسرے مؤرخین نے جنگ کے حالات کافی تفصیل سے لکھے ہیں جن میں کی بعض باتیں چاہے موجودہ زمانہ والوں کی عقل میں نہ آئیں ۔

۱؎ تاریخ خمیس ج ۲ صفحہ ۵۰

مگر مؤرخین نے بلا تفریق فرقہ اُنہیں درج کیا ہے جیسے حضرت علیؓ کے ہاتھ سے ایک یہودی کی ضرب سے سپر کا چھوٹ کر گرنا، کسی یہودی کا اُسے لے کر بھاگنا اور پھر آپ کا غضبناک ہو کر ایک جست لگا کر خندق کے پار جانا اور قلعہ کے آہنی دروازہ کو اُکھاڑ کر ہاتھ میں بطور سپر لے لینا اور جنگ میں مصروف ہونا[۱]

یا دوسری روایت کے الفاظ کے لحاظ سے قلعہ کے پاس جو ایک دروازہ تھا، اُسے ہاتھ میں اُٹھا کر سپر بنا لینا اور جنگ کے اختتام کے بعد تک اُسے ہاتھ میں لیے رہنا اور مکمل فتح حاصل ہونے کے بعد اُس دروازہ کو ہاتھ سے پھینکنا، پھر آٹھ آدمیوں کا مل کر اُس دروازہ کو پلٹنے کی کوشش کرنا اور اُن سب کا اس کوشش میں ناکام ہونا[۲] بلکہ ستر آدمیوں کی تعداد جو اُس دروازہ کو بمشکل جنبش دے سکی[۳] یا یہ کہ دروازہ پتھر کا تھا جو چار گز لمبا اور دو گز چوڑا تھا اور ایک گز بلندی پر نصب تھا۔ اسے آپ نے اُکھاڑ کر پس پشت پھینک دیا اور قلعہ میں داخل ہو گئے[۴] ــــ وغیرہ وغیرہ۔

یہ روایات بلا تفریق فرقہ مؤرخین اسلام صدر اول سے اب تک برابر درج کرتے آئے۔

اب ابن خلدونی طریقہ تحلیل و تجزیہ سے کوئی منقولات سے

---

[۱] مدارج النبوۃ ج ۲ صفحہ ۲۴۵ [۲] ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۱۸۷، ابن اثیر ج ۲ صفحہ ۹۱، ابو الفداء ج ۱ صفحہ ۱۴۷ [۳] تاریخ خمیس ج ۲ صفحہ ۵۱
[۴] تاریخ یعقوبی ابن واضح کاتب عباسی مطبوعہ نجف ۱۳۸۴ھ ۱۹۶۴ء ج ۲ صفحہ

ہٹ کر خالص عقلی اصول پر روایات سے نتیجہ نکالنے کی کوشش کرے تو بھی اُسے اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ کوئی ایسا غیر معمولی مظاہرۂ جرأت و ہمت اور شجاعت کا اس میدان خیبر میں حضرت علی بن ابی طالبؑ سے وقوع میں آیا تھا جس کی وجہ سے اس قسم کی روایتیں زبان زدِ خلائق ہو گئیں۔ ورنہ آخر خود حضرت علیؑ کے لیے خیبر کی مہم کے علاوہ کسی اور معرکہ میں اس طرح کی باتیں کیوں راویوں کی زبان پر نہیں آئیں اور حضرت علیؑ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے آخر کبھی بھی اس طرح کی چیزیں کیوں کسی بھی راوی نے جو اُن کا عقیدت مند بھی ہو کیوں بیان نہیں کیں؟ پھر یہ کہ یہ تاریخیں نہ دیالمہ کے زیر اثر تحریر ہوئیں، نہ فاطمی سلاطین مصر کے زیر سایہ، نہ صفوی یا قاچاری شاہان ایران کے دَور کی پیداوار ہیں۔ بلکہ یہ تاریخیں آخر زمانۂ بنی اُمیہ سے لے کر بنی عباس کے عہد کی ہیں یا بنی اُمیہ کے بعد والے مغربی قلمرو مملکت میں تحریر ہوئیں جہاں شیعی اثرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل حقیقت اتنا وزن رکھتی تھی کہ اُسے ماحول اور سرزمین کا کوئی دباؤ مغلوب و مضمحل نہیں کر سکا۔

مسٹر کے۔ اے حمید بی۔ اے (لندن) بیرسٹر لاہور نے جنگ خیبر کے تفصیلات کو باوجودیکہ اجمال کی بہت دبیز تہوں میں چھپایا ہے پھر بھی اُن کو اتنا لکھنا ہی پڑا ہے کہ:

"سرکارؐ نے حضرت علیؑ کو طلب فرمایا اور قلعۂ ناعم پر حملہ کے لیے ہدایات دیں۔ حضرت علیؑ نے میدان میں وہ کارہائے نمایاں دکھلائے جن کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ قلعۂ ناعم کی فتح کے بعد حضرت علیؑ نے قلعۂ قموص کو سر کیا۔ اسی طرح مسلمانوں نے یکے بعد دیگرے کئی قلعے فتح کر لیے"[1]

علامۂ طبرسی تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مخبر نے جا کر رسول خداؐ کو خوشخبری دی کہ علیؑ قلعہ کے اندر داخل ہو گئے۔ یہ سن کر رسول خداؐ قلعہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُدھر سے حضرت علیؑ استقبال کے لیے نکلے۔ رسولؐ نے فرمایا کہ تمھارے کارنامہ کی پوری اطلاع مجھے ہوئی۔ اللہ تم سے راضی ہے اور میں بھی تم سے خوش ہوں۔ یہ سننا تھا کہ علیؑ رونے لگے۔ رسولؐ نے فرمایا "یا علی! روتے کیوں ہو؟" عرض کیا یہ گریہ مسرت ہے اس بات پر کہ اللہ اور رسولؐ مجھ سے خوش ہیں۔[2]

صفیہؓ کی اسیری اور پیغمبر خداؐ کی دلجوئی۔

جنگ کے اختتام پر جو لوگ اسیر کیے گئے، ان میں رئیس یہود حیی بن اخطب کی بیٹی صفیہ بھی تھیں۔ حضرت علیؑ نے بلال کو بلا کر فرمایا کہ انھیں خود رسول خداؐ کے پاس لے جانا کہ جو وہ مناسب سمجھیں وہ ان کے ساتھ سلوک کریں۔ اس سے ظاہر ہے کہ خود حضرت علیؑ کے

---

[1] تاریخ مسلمانان عالم حصۂ اول صفحہ ۲۴۴   [2] اعلام الوریٰ

بھی یہ پہلو زیر نظر تھا کہ رئیسان قوم کی خواتین کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا جا سکتا جو عام قیدیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

بلال انھیں لے چلے مگر اُدھر سے جدھر اُن کے عزیزوں کے لاشے پڑے ہوئے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر اُن کی حالت بہت غیر ہوگئی۔ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ معلوم ہوا تو بلال پر بہت ناراض ہوئے۔ فرمایا اے بلال! کیا تمھارے دل سے رحم بالکل سلب ہوگیا ہے؟! پھر آپ نے اُن کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ خود اُن سے شادی فرمائیں۔ علامۂ طبرسی کی تصریح ہے کہ "اعتقھا و تزوجہا" "آپ نے انھیں آزاد کیا اور اُن سے شادی کی۔"[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کے ساتھ شاہزادیوں کا سا برتاؤ کیا۔ یعنی یہ نہیں ہوا کہ کنیز کی صورت سے بحق ملکیت اُن میں تصرف کیا گیا ہو بلکہ ایک آزاد عورت کی طرح اُن کا عقد ہوا جس میں تراضی طرفین لازمی چیز ہے۔

---

[1] اعلام الوریٰ

تمت

پبلشر
مرزا عابد حسین
آنریری سکریٹری امامیہ مشن
لکھنؤ